فتح المنان فی حکم المبیع اذا
ظہر فیہ الزیادۃ أو النقصان
مبیع میں کمی یا
زیادتی ظاہر ہونے
کا تحقیقی مطالعہ
کتاب البیوع کا معرکۃ الآراء مسئلہ ''اصل وصف'' کی وضاحت،
اصول وضوابط، اس مسئلے سے متعلق فقہائے احناف کے عبارات
کی تشریح ممکنہ اشکالات کا تجزیہ، عصر حاضر میں اس کی تطبیق وتحقیق
تحریر
بندہ عبید الرحمٰن عفی عنہ
رفیق ومدرس مدرسہ دار العلوم الرحمانیہ مردان
ناشر: مرکز البحوث الاسلامیہ، مردان

# فہرستِ مضامین

# عرضِ مولف

الحمد لله جلَّ وعلا والصلاة والسلام على سيد الأصفياء وخاتَم الأنبياء، وبعد:

آج سے ایک عرصہ پہلے جب بندہ درجہ رابعہ کا طالب علم تھا، شرح الوقایۃ میں یہ مسئلہ استاد صاحب نے پڑھایا کہ اگر کسی نے مکیلی اور موزونی چیز خریدی اور بعد میں معلوم ہوا کہ خریدی ہوئی چیز مقررہ مقدار سے کم یا زیادہ ہے تو خریدار اگر اس کو خریدنا چاہے تو پوری قیمت دینے کی ضرورت نہیں بلکہ جتنی چیز موجود ہے اسی کے مطابق قیمت دینا ضروری ہے اور زیادہ نکلنے کی صورت میں دکاندار کو واپس کرنا ضروری ہے۔

اس کے برعکس اگر کسی نے کپڑا، زمین وغیرہ کوئی ایسی چیز خریدی جو وزن، تول اور لیٹر وغیرہ کے ذریعے فروخت نہیں ہوتی بلکہ گز کے ذریعے ناپ کر اس کی خرید وفروخت ہوتی ہے، اور وہ لین دین کے وقت طے شدہ مقدار سے کم یا زیادہ نکلے تو اس کا حکم مختلف ہے۔

بعد میں بار بار غور کرنے کے باوجود مسئلہ پوری طرح سمجھ نہیں آیا، اس کے بعد موقوف علیہ کے سال بھی استادِ محترم کے مکرر سمجھانے کے باوجود اپنی کم فہمی کی وجہ سے وہی پرانی شکایت رہی۔ فراغت کے بعد پہلے سال جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے شرح الوقایہ پڑھانے کی توفیق مرحمت فرمائی تو مطالعہ کے دوران ہی تردد کی وہی پرانی صورت حال برقرار رہی، مسئلہ کی اصل بنیاد تک

پہنچنے کے لئے کتابوں کی کافی ورق گردانی کی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا، البتہ صاحب عنایہ کے کلام سے صرف اتنی طفلِ تسلی ہوئی کہ یہ مسئلہ صرف اس ناچیز ہی کے لئے مشکل نہیں، بلکہ اکابر فقہائے کرام بھی اس کو فقہ کے مشکل ترین مسائل کی فہرست میں شمار کرتے ہیں۔

صاحبِ عنایہ کی عبارت نے ایک حد تک میری رہنمائی کی لیکن چونکہ اس کے علاوہ کوئی صریح جزئیہ نظر سے نہیں گذرا، اس لئے تردد ہنوز باقی رہا۔

اس کے بعد ہوا یہ کہ ہمارے یہاں مدرسہ کے عام معمول کے مطابق تاجر برادری کے لئے دراسات دینیہ کا انتظام کیا جاتا ہے، پہلے سال اس میں "بہشتی زیور" پڑھانے کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی تھی، اس سال دراسات میں کچھ ایسے ساتھی بھی زیر تعلیم تھے جن کا مشغلہ اور کاروبار ہی کپڑوں کی مارکیٹ سے متعلق تھا، اس لئے عام طریقہ کے مطابق میں نے ان کو مسئلہ بتایا اور وزن کے ذریعے فروخت ہونے والے اشیاء اور کپڑے کے درمیان فرق بتایا جس سے وہ کافی حیران ہوئے اور بڑی تعجب سے کہا کہ ہمارے ہاں مارکیٹ میں تو اس کا کوئی تصور نہیں۔

میرا اشکال چونکہ پہلے سے برقرار تھا اس لئے ان کو پوری صورت حال بتائی اور ان سے وعدہ کیا کہ اس مسئلہ کی مکمل تحقیق کرکے آپ کو آگاہ کروں گا، اس کے بعد اس مسئلہ کی تحقیق شروع کردی، اور کئی مہینوں کی مکمل تگ ودو کے بعد یہ تحریر تیار ہوئی۔

اس تحریر کی تیاری میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، بعض اوقات ایسا بھی پیش آیا کہ فقہ حنفی بلکہ اس کے ساتھ مذاہب اربعہ کے تمام موجودہ مطبوعہ ذخیرہ، جن تک رسائی کی اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی، پر بھی اکتفاء نہ ہو سکا بلکہ ملک کے بعض دیگر جامعات کے کتب خانوں کا دورہ کیا گیا جس میں وہاں کے بعض غیر مطبوع ذخیرہ سے بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔

تحریر مکمل ہو جانے کے بعض علماء کرام اور مفتیان کی خدمت میں اصلاح وتصحیح کے لئے پیش کیا گیا، ان حضرات نے کافی مفید مشوروں اور اصلاحات سے نوازا، اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر نصیب فرمائے۔

آخر میں میں اپنے ان تمام محسنین کا شکریہ ادا کرنا نہایت ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اس ناکارہ کے ساتھ تحریر کے مختلف مراحل میں احسان اور تعاون کا ثبوت دیا۔

ناکارہ: عبید الرحمن

دار الافتاء مدرسہ دار العلوم الرحمانیہ، مردان

۱۴ ذی القعدۃ ۱۴۳۶ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## بحث کی ترتیب

اس بحث کی ترتیب یہ ہے کہ اولاً جن بنیادی قواعد کی بناء پر فقہاء کرام نے یہ مسائل متفرع فرمائے، ان کی وضاحت کی گئی، اور یہ کل پانچ قواعد ہیں جن کو نمبر وار "ضابطہ" کے عنوان سے ذکر کیا گیا۔

اس کے بعد "اصل" اور "وصف" کی وضاحت کی گئی کہ فقہاء کرام کی اصطلاح میں اس سے کیا مراد ہے؟ یہ اصطلاحات کب سے استعمال ہونا شروع ہوئے؟ اور اس کی بنیاد کیا ہے؟

اس کے بعد یہ ذکر کیا گیا کہ تول کر یا ناپ کر جو اشیاء فروخت ہوتی ہوں، اس کی اگر ایک مقرر مقدار کی خرید و فروخت کا معاملہ ہو جائے اور بعد میں معلوم ہو جائے کہ لین دین کے وقت جو مقدار طے ہو چکی تھی، مبیع کی واقعی مقدار اس سے کم ہے، تو اس صورت کا کیا حکم ہے؟ اور اس حکم کی شرعی بنیاد کیا ہے؟ فقہاء کرام نے اس حوالے سے مختلف اشیاء کے حکم میں جو فرق بیان فرمایا اس کی مکمل توضیح کی گئی۔

آخر میں اس بات کی وضاحت کی گئی کہ عصر حاضر میں یہ مسئلہ پہلے کی طرح جوں کا توں برقرار رہے گا، یا قدر و شمار کے آلات مختلف ہونے اور صناعت اور بناوٹ کے نت نئے طریقوں کی ایجاد کی وجہ سے اس مسئلہ میں فرق آئے گا یا نہیں؟

مسئلہ کی اصل حقیقت اور بنیاد سمجھنے کیلئے چند مقدمات ذہن نشین کر لیناضروری ہے۔

## ضابطہ نمبرا:

خرید وفروخت کی دو مختلف صورتیں ہیں، جن کا حکم بھی مختلف ہے:

الف: اگر خرید وفروخت میں کسی چیز کی ایک خاص مقدار طے کی جائے اور بعد میں معلوم ہو جائے کہ خریدی ہوئی چیز کی مقدار فریقین کے متعین کردہ مقدار سے زائد ہے تواس صورت میں زائد مقدار بائع ہی کی ہوگی، کیونکہ خرید فروخت درحقیقت ایجاب وقبول کانام ہے جس مقدار کی ایجاب و قبول ہوچکی وہی مبیع ہے، اس کے علاوہ جوزائد ہے وہ بدستور بائع ہی کی ملکیت ہے، مشتری کا اس میں کوئی حق نہیں۔

کیونکہ جب ایجاب وقبول میں اس کاذکر نہیں آیا تو بیع اس کو شامل نہیں ہوئی،اور انتقال ملک کا کوئی اور سبب یہاں موجود نہیں،اس لئے یہ زائد مقدار بائع کی ملک سے نہیں نکلا، بلکہ بدستور بائع ہی اس کامالک ہے۔

ب: اگر عقد کے دوران سودے کی مقدار متعین نہ کی جائے بلکہ پوری چیز کی بیع کی جائے مثلاً گندم کاایک ڈھیر سامنے پڑا ہو،اور مالک یہ کہے کہ میں نے یہ ڈھیر آپ پر دس ہزار کافروخت کیا، خریدار نے اس کو قبول کیا،اس صورت میں بیع منعقد ہو جائے گی، اگر خریدار یافروخت کنندہ اس کو دس مَن سمجھتارہا اور

خریدنے کے بعد معلوم ہوا کہ گندم دس من سے کم یا زیادہ ہے تو اس صورت میں کسی کو اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ایجاب وقبول مقدار کی نہیں ہوئی بلکہ پوری ڈھیر کی ہوئی ہے اور وہ اپنی حالت پر برقرار ہے لہٰذا محض خریدار یا فروخت کنندہ کے خیالات واندازوں کی وجہ سے کسی کو خیار حاصل نہیں ہوگا۔

"قنیۃ المنیہ" میں اس قسم کے مسائل کے لئے ایک مستقل باب باندھا ہے"باب فی ظهور الغلط فی قدر المبيع والثمن بعد ما وقع القرار بينهما على حساب آخر" اس باب میں اس نوع کے مختلف جزئیات نقل فرمائے[1]، "ردالمحتار" میں اس پورے باب کو نقل کیا گیا۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

مفاده: أن المعتبر ما وقع عليه العقد من العدد، وإن كان ظن البائع أو المشتري أنه أقل أو أكثر ولذا قال: في القنية: عد الكواغد فظنها أربعة وعشرين وأخبر البائع به ثم أضاف العقد إلى عينها ولم يذكر العدد ثم زادت على ما ظنه فهي حلال للمشتري. ساومه الحنطة كل قفيز بثمن معين وحاسبوا فبلغ ستمائة درهم فغلطوا، وحاسبوا المشتري بخمسمائة، وباعوها منه بالخمسمائة ثم ظهر أن فيها غلطا لا يلزمه إلا خمسمائة.

---

[1] قنية المنية، كتاب البيوع، قبيل باب خيارالشرط، ص٢٤٠

"اعتبار اسی مقدار کا ہو گا جس کا ایجاب وقبول ہوا ہے اگر چہ فروخت کنندہ اور خریدنے والے کا خیال یہ ہو کہ خریدی ہوئی چیز کم یا زیادہ ہے اسی لئے "قنیہ" میں لکھا ہے کہ فروخت کنندہ نے کاغذ کے صفحات کو شمار کرکے یہ خیال کیا کہ یہ چوبیس (۲۴) صفحات ہیں، خریدنے والے کو بھی بتایا۔

اس کے بعد اس نے ان موجودہ صفحات کی طرف اشارہ کرکے بیچ دیا اور صفحات کی مقدار ذکر نہ کی، فروخت کنندہ کے ذہن میں مبیع کی جو مقدار تھی، مبیع اس سے زیادہ مقدار کی نکلی تو زیادہ مقدار خریدنے والے کے لیے جائز ہے۔

گندم کے ہر ہر پیمانہ کی ایک خاص قیمت مقرر ہوئی، عاقدین نے جب حساب کیا تو قیمت چھ سو درہم کو پہنچ گئی اور انہوں نے غلطی سے پانچ سو درہم کا سمجھ کر خرید و فروخت کا معاملہ کیا۔ بعد میں یہ بات ظاہر ہوئی کہ دونوں غلطی کا شکار ہوئے تو اس صورت میں خریدنے

والے پر صرف پانچ سو (۵۰۰)روپے ہی لازم ہوں گے۔"[1]

اسی طرح مجلۃ الاحکام العدلیۃ میں ہے:

(المادة ٢٢٢) إنما يعتبر القدر الذي يقع عليه عقد البيع لا غيره.

**"(خریدار کو صرف وہی مقدار ملے گی)جو عقد بیع کے وقت مقرر ہوئی اور بس"[2]**

**اس کی شرح کرتے ہوئے علامہ محمد خالد الاتاسی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:**

فما زاد على القدر المعين في عقد البيع لا يدخل في العقد فيكون للبائع ( طحطاوي وبحر)۔۔ومفاده: إن المعتبر ما وقع عليه العقد من العدد وإن كان ظن البائع أو المشتري أنه أقل أو أكثر

**"لہذا مقررہ مقدار سے جو کچھ زائد ہو وہ بیع کے تحت داخل نہیں**

---

[1] حاشية ابن عابدين على الدر المختار، كتاب البيوع، مطلب: المعتبر ما وقع عليه العقد وإن ظن البائع أو المشتري أنه أقل أو أكثر، ٤/٥٤٣۔

[2] مجلة الأحكام العدلية، البيوع، الباب الثاني، الفصل الثالث في بيان المسائل المتعلقة بكيفية بيع المبيع، ص ١٩٣۔

ہوگا بلکہ وہ بدستور بائع ہی کا شمار ہوگا، خلاصہ یہ ہے کہ بیع میں مبیع کے صرف اسی مقدار کا اعتبار ہوتا ہے جو عقد بیع کے وقت مقرر ہو جائے، اگرچہ خریدار یا فروخت کنندہ اس سے زیادہ کا خیال کر رہے ہوں (لیکن ان کے خیال کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ جس مقدار کا ایجاب و قبول ہوا ہے، وہی معتبر ہوگا)"[1]

## ضابطہ نمبر ۲:

دنیا جہاں میں جتنی اشیاء کی خرید و فروخت ہوتی ہے، حضرات فقہاء کرام (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک اس کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں، ذوات الامثال اور ذوات القیم۔

ذوات الامثال ان اشیاء کو کہا جاتا ہے جن کے افراد و اجزاء تقریباً ایک جیسے ہوں، اس کے مختلف افراد یا متعدد اجزاء میں باہم کوئی ایسا خاص تفاوت نہ ہو جو قیمت پر اثر انداز ہو سکے، بلکہ اس کے تمام اجزاء ایک ہی قیمت پر فروخت ہوتے ہوں۔

---

[1] شرح المجلة للعلامة محمد خالد الأتاسي، ج٢ص١٢٦

اور جن اشیاء کی بعینہ نظیر بازار میں دستیاب نہ ہو، اس کے افراد میں اتنا تفاوت ہو جس کی وجہ سے وہ ایک ہی قیمت پر فروخت نہ ہوتے ہوں، اس کو فقہاء کرام ذوات القیم سے تعبیر فرماتے ہیں۔

## مثلی اور قیمی ہونے کا دار و مدار

یاد رہے کہ مثلی اور قیمی ہونے کا دار مدار محض کیل، وزن یا گز کے ساتھ فروخت ہونے پر نہیں، کسی چیز کے تول اور پیمانے کے ساتھ فروخت ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مثلی بھی ہو، نہ ہی گز کے ساتھ بک جانے کی وجہ سے کوئی چیز قیمی بنتی ہے بلکہ اس کا اصل دار و مدار وہی ہے جو اوپر تحریر کیا جا چکا۔

## مثلی اور قیمی اشیاء کے متعلق ایک ضابطہ

فقہاءِ حنفیہ میں سے علامہ ابنِ قاضی سماوہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے جامع الفصولین میں اس پر مستقل باب باندھا ہے کہ کون کونسی اشیاء قیمی کہلاتی ہیں اور کن چیزوں کو مثلی کہا جاتا ہے، اس باب کے اندر مختلف اشیاء گنوانے اور حکم بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> ليس كل مكيل مثلياً ولا كل موزون وإنما المثلي من الكيلي والوزني ما هو متقارب وأما المتفاوت فليس بمثلي فكان الكيلي والوزني والعددي سواء. قال "خ": في المذروعات يجب أن تكون كذلك

"ہر کیلی اور موزونی چیز مثلی نہیں ہوا کرتی، بلکہ مثلی اس چیز کا

نام ہے جو عددی متقارب ہو (یعنی گنتی کے اعتبار سے فروخت ہونے والے وہ تمام اشیاء جن کے مختلف افراد میں باہم خاص فرق نہ ہو بلکہ سب ایک ہی قیمت پر مل جاتے ہوں) اور جہاں تک عدد متفاوت ہے تو وہ مثلی نہیں ہے۔لہٰذا کیلی،وزنی اور عددی (وغیرہ تمام) چیزیں (اس قاعدہ کے تحت) برابر ہیں، مذروعات کے بارے میں کہا گیاکہ اس کے لیے بھی اس طرح ہونا ضروری ہے۔"[1]

فقہ کے متعدد ابواب میں مثلی اور قیمی کی بحث آتی ہے، چونکہ یہ ایک ظاہر اور بدیہی چیز ہے جس کی تعریف کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ ان جیسی اشیاء کی تعریف کرنے سے بعض اوقات ابہام اور پیچیدگی کی فضاء پیدا ہو جاتی ہے،اسلئے عام حضرات فقہاء کرام نے بھی اس کی کوئی خاص تعریف کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی بلکہ ہر جگہ وضاحت کرنے کیلئے اس باب کے مناسب الفاظ استعمال فرمائیں۔

---

[1] جامع الفصولين، الفصل الثالث والثلاثون في أنواع الضمانات الواجبة وكيفياتها،ماهومثلي وماليس بمثلي، ٢/٩٧،اسلامي كتب خانه، بنوري تاؤن)

## مثلی اور قیمی کے متعلق شیخ محمد تھانوی کی وضاحت

مزید وضاحت کیلئے شیخ محمد بن علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت پیش کی جاتی ہے جنہوں نے سابقہ تمام فقہاء کرام کے کلام کو اس حوالہ سے جمع فرمایا، جس سے یہ بحث اچھی طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے:

"فقہاء کے ہاں مثلی اس چیز کو کہا جاتا ہے کہ جس کی مثل مارکیٹ میں دستیاب ہو اور اس کے مختلف اجزاء میں کوئی خاص فرق نہ ہو جیسا کہ مکیلی، موزونی اور عددی متقارب چیزیں، عددی کی مثال جیسے اخروٹ، انڈے، بینگن، کچی اور پکی اینٹیں۔

اس کے برعکس چیزوں کو غیر مثلی کہا جاتا ہے جیسے جانور، سامان اور عددی متفاوت اور زمین، عددی متفاوت کو بھی قیمی کہا جاتا ہے کیلی، وزنی اور عددی اشیاء سے صرف وہ چیزیں مراد نہیں جو خرید اور فروخت کے وقت تولی یا شمار کی جاتی ہو بلکہ اس سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کا تبادلہ ثمن کے ساتھ کیل، وزن اور عدد پر مبنی ہو، مثلی چیز میں یہ شرط بھی ہے کہ صناعت سے اس میں تبدیلی نہ آتی ہو۔ بعض اشیاء کو فی کلو یا فی لیٹر کے حساب سے فروخت کیا جاتا ہے، ایسا ان اشیاء میں ہوتا ہے جن کے مختلف افراد اور اجزاء میں کوئی خاص فرق نہ ہو اور جب کوئی فرق موجود نہیں تو مثلی شمار ہوگا۔ ہم نے مثلی چیز میں یہ شرط لگائی کہ صناعت کی وجہ سے مختلف نہ ہوتی ہو کیونکہ

صناعت سے جو چیز مختلف ہو جائے، وہ مثلی نہیں رہتی جیسے پیتل کا گول برتن اور ہانڈی یہ دونوں چیزیں مثلی نہیں ہیں۔ جب یہ بات معلوم ہوئی تو مصنوعات کا حکم سمجھنا بھی آسان ہو گیا، لہٰذا جو کپڑا فی گز مستقل قیمت کے ساتھ فروخت ہوتا ہے، اس میں کوئی خاص تفاوت نہیں ہو گا اسی وجہ سے بیع سلم بھی اس میں جائز ہے کیونکہ اس کی لمبائی اور چورائی وغیرہ پہلے سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

فقہاء نے مثلیات اور ذوات القیم چیزوں کی تفصیلی فہرست ذکر فرمائی ہیں مگر اس کی کوئی ضرورت نہیں (بلکہ اصول سمجھ لینا کافی ہے کہ) جس چیز کی مثل مارکیٹ میں دستیاب ہو اور دونوں میں کوئی خاص فرق بھی نہ ہو تو وہ مثلی ہو گی اور جو اس طرح نہ ہو تو وہ قیمی ہے، اس تفصیل کے مطابق مٹی، صابون اور سکنجبین (ترش اور میٹھی چیز سے بنا ہوا شربت) کو مثلیات میں سے شمار کر لینا چاہئے اگرچہ جامع الرموز میں ان کو قیمی قرار دیا گیا ہے۔

فصول عمادیہ (نامی کتاب) میں لکھا ہے کہ عددی متقارب (وہ اشیاء جو گنتی اور درزن کے اعتبار سے فروخت ہوتے ہوں اور ان کے مختلف افراد میں کوئی خاص فرق بھی موجود نہ ہو) اور ہر وہ چیز جو تول کر فروخت کی جاتی ہو اور مختلف حصوں میں تقسیم کرنے سے اس میں کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو وہ مثلی ہے۔

امام ابو الیسرؒ نے فرمایا کہ ہر مکیلی اور موزونی چیز مثلی نہیں بلکہ مثلی ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف افراد ایک دوسرے کے قریب قریب ہوں، ان میں اتنا فرق نہ ہو جس کی وجہ سے اس کی قیمت مختلف ہو جائے۔ لہٰذا جس چیز کے افراد کے درمیان تفاوت ہو یعنی اتنا فرق ہو جو قیمت پر اثر انداز ہو جائے تو وہ مثلی نہیں۔

مکیلات، موزونات وغیرہ تمام اشیاء کا یہی حکم ہے اسی طرح جو چیزیں ناپ کر فروخت ہوتی ہیں، ان کا بھی یہی حکم ہونا چاہیے اگرچہ صاحب محیطؒ نے اس جیسی تمام چیزوں کو ذوات القیم میں شمار کیا۔[1]

عصر حاضر میں کمپنیوں کی جتنی مصنوعات ہیں وہ چونکہ ایک ہی فارمولہ پر بنائی اور تیار کی جاتی ہیں، ایک کمپنی کے مصنوعات میں کوئی خاص تفاوت نہیں ہوتا، اسلئے کشاف کے درج بالا تحقیق کے مطابق یہ مصنوعات ذوات الامثال کہلائیں گے۔ مثلاً ڈل کمپنی کے کور آئی تھری لیپ ٹاپز ایک ہی فارمولے کے تحت کمپنی سے تیار ہو کر آتے ہیں، اب اس قسم کے لیپ ٹاب مثلیات میں سے ہیں کیونکہ بازار اس کے نظائر و امثال سے بھرا پڑا ہے اور ان کی قیمت میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہوتا۔

---

[1] کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم (٢ / ١٤٥٤)

## اقدار کے بدلنے سے اشیاء کی حیثیت میں فرق

چونکہ مثلی اور قیمی ہونے کا مدار مندرجہ بالا امر پر ہے اسلئے اس حوالے سے زمانے کے ساتھ یہ حیثیت ختم بھی ہو سکتی ہے، بعض اشیاء کسی زمانے میں قیمی سمجھتی جاتی تھی لیکن آج کل مشینوں کی ایجاد نے اس کو مثلی بنادیا۔

مثلاً کتاب ہی کو لیجئے، پہلے زمانے میں جب طباعت وغیرہ کا یہ موجودہ انتظام نہیں تھا تو مختلف لوگ ہاتھوں سے کتابیں لکھ لکھ کر تیار کیا کرتے تھے، ظاہر ہے دو مختلف انسانوں کے اتنے طویل المیعاد کام میں کب مکمل طور پر مماثلت قائم رہ سکتی تھی۔

نتیجہ یہ تھا کہ ایک ہی کتاب لکھنے والوں اور دیگر متعدد عناصر کی بدولت مختلف قیمت کی حامل تصور کی جاتی تھی، لیکن الحمدللہ وسیع پیمانے پر کاغذ کی دستیابی اور طباعت کی مشینوں کی بھرمار سے وہی کتاب اب مثلی ہو گئی۔

اگر کسی خاص مکتبے کی بدائع الصنائع خریدنا ہو تو ایک ہی نسخے کی قیمت طے کرنا ضروری ہو گا، ہر ہر نسخے کی مختلف قیمت نہیں ہے کیونکہ اس کے افراد و اجزاء میں کوئی اتنا تفاوت نہیں جس کی وجہ سے اس کی قیمت مختلف ہو۔

## ضابطہ نمبر ۳:

ذوات الامثال اشیاء میں قیمت مبیع کے اجزاء یا افراد پر خود بخود تقسیم ہو گی، یعنی اگر ایک شخص کوئی مثلی چیز خاص مقدار میں خریدے تو جتنی قیمت پر خریدا ہے وہ مجموعی رقم اس چیز کے اکائیوں پر منقسم سمجھی جائیگی مثلاً ایک شخص نے بازار سے

بیس کلو فائن آٹا ہزار روپے میں خریدا تو اگرچہ دکاندار اور خریدار نے فی کلو کے حساب سے قیمت مقرر نہیں کی لیکن آٹا چونکہ مثلی ہے اسلئے یہ سمجھا جائے گا کہ فی کلو پچاس روپے کے حساب سے خریداری عمل میں آئی۔

## ذوات القیم کو فروخت کرنے کی دو مختلف صورتیں

جو اشیاءذوات القیم کے قبیل سے ہیں، ان کو فروخت کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

**الف:** ایسی چیز کی صرف مجموعی قیمت طے ہو جائے اور ہر ہر جز کو متعین کر کے اس کی قیمت طے نہ کی جائے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اس طرح کرنے کی صورت میں کسی چیز کی مجموعی قیمت اس کے اکائیوں پر تقسیم نہیں ہو سکتی، مثلاً ایک شخص نے بیس بکریاں دو لاکھ روپے میں خریدی، تو اب خریدار یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے فی بکری پورے دس ہزار میں خریدی ہے، کیونکہ بکریوں میں بعض ایسی صفات ہوتی ہیں جو اس کو دوسری بکریوں سے خاص کر دیتی ہے تمام بکریوں میں ان صفات کا پایا جانا ضروری نہیں ہوتا۔

مجموعی طور پر بیچنے کا یہی فائدہ ہوتا ہے کہ ایک بکری مثلاً آٹھ ہزار قیمت کے برابر ہو گی ایک دس اور ایک بارہ ہزار کی، سب کو ایک ساتھ بیچنے میں فروخت کنندہ کو اس مشقت میں نہیں پڑنا پڑتا، بلکہ ایک بکری کی خوبی دوسرے کے کمی کی تلافی کر دیتی ہے۔

**ب:** مجموعی قیمت کے ساتھ ساتھ تمام افراد کی مستقل قیمت بھی متعین کی جائے مثلاً عقد کے وقت یہ طے ہو جائے کہ یہ سو بکریاں دو لاکھ روپے میں ہیں، ہر ہر بکری دس ہزار روپے کی ہے، اس کا حکم ذوات الامثال اشیاء کا ہے۔

بکری اگرچہ خود ذوات الامثال میں سے نہیں ہے لیکن جب دونوں عاقدین نے ہر ہر بکری کی قیمت الگ سے مقرر کر دی تو گویا وہ اسی تفصیل و تقسیم پر راضی ہیں، ضابطہ کے مطابق یہ ثمن ہر بکری پر تقسیم نہ ہونا چاہئے لیکن عاقدین کی تصریح کی وجہ سے ایسا کرنا پڑا۔

مثلی اور قیمی اشیاء کے اندر یہ فرق مارکیٹ کا عام عرف ہے، لوگوں کے درمیان یہی متعارف و متعاہد ہے، یہی وجہ ہے کہ آئے دن اس کے مطابق تاجروں کا عمل ہوتا ہے اور دیگر لوگوں کا بھی جب واسطہ پڑتا ہے تو بلا نزاع و نکیر اسی پر عمل در آمد کی جاتی ہے۔

فقہاء کرام نے بھی یہی کچھ تحریر فرمایا ہے، چنانچہ علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

> لأن الثمن ينقسم بالأجزاء على أجزاء المبيع المثلي مكيلا أو موزونا[1]
>
> **"مثلی چیز یعنی (مثلاً) مکیلی اور موزونی اشیاء کی (مجموعی) قیمت اس کے اجزاء پر تقسیم ہوتی ہے"**

---

[1] فتح القدير للعاجز الفقير ، كتاب البيوع، ٤٧٦/٥

## ضابطہ نمبر ۴:

بیع کے لزوم کیلئے ایجاب وقبول کے درمیان یکسانیت (اتحاد و موافقت) ضروری ہے یعنی دکاندار جتنی مقدار مبیع کو جتنی رقم پر بیچنے کاایجاب کرتا ہے قبول کرنے والاا تنے ہی مقدار کواسی ثمن کے ساتھ قبول کرے، اگر مبیع یا ثمن کی مقدار میں کمی و بیشی کے ساتھ قبول کرے گا تو بیع لازم نہیں ہوگی، بلکہ خریدار کی طرف سے یہ نیاایجاب تصور ہوگااور مالک کو پورا اختیار حاصل ہے کہ خریدار کے اس نئے ایجاب کو قبول کرے یااس کو رد کرے،ایجاب و قبول میں اتحاد کو ختم کرنااور یکسانیت برقرار نہ رکھنے کو" تفریقِ صفقہ "سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

## تفریق صفقہ کے ممنوع ہونے کی وجہ

حضرات فقہاءِ کرام فرماتے ہیں کہ مبیع قبض کرنے سے پہلے تفریقِ صفقہ درست نہیں کیونکہ اس سے دوسرے فریق کی رضامندی پراثر پڑتا ہے، جب کہ خرید وفروخت کے معاملات میں دونوں عاقدین کی رضامندی ضروری ہے۔ مثلاًزید ایک من گندم ۱۵۰۰روپے میں خریدنے کاایجاب کرتا ہے، عمر تیس کلوگندم کی حدتک قبول کرتا ہے تو یہاں اگرچہ ایجاب وقبول عمل میں آیا لیکن چونکہ دونوں میں پوری طرح یکسانیت موجود نہیں،اسلئے بیع بھی لازم نہیں ہوگی۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ تیس کلوگندم خریدنے میں زید کی رضامندی کا کوئی یقین نہیں، ممکن ہے کسی مصلحت کے پیشِ نظراس کوپورا من چاہئے تھا اور تیس کلو

خریدنا اس کو منظور نہ ہو، البتہ اگر عمر کے اس ایجاب کو زید قبول کرے تو تیس کلو میں بھی بیع لازم ہو جائیگی۔

اور چونکہ قاعدہ نمبر ۳ کے مطابق ایک من گندم کی قیمت اس کے اجزاء پر تقسیم ہوئی اسلئے تیس کلو گندم کی اگر مستقل طور پر قیمت مقرر نہ بھی کی تو بھی کوئی حرج نہیں، بیع درست اور لازم سمجھی جائیگی۔

مندرجہ بالا تفصیل کے مطابق جو اشیاء ذوات القیم کے قبیل سے ہوں اس میں چونکہ اجزاء کی قیمت معلوم نہیں اسلئے وہاں دوبارہ قبول کرنا ہی کافی نہیں ہوگا، بلکہ ازسرنو قیمت کا تعین و تقرر بھی ضروری ہوگا۔اسی طرح اگر خریدار نئے ایجاب کے ساتھ اپنی طرف سے کسی قیمت کی بھی پیشکش کرے اور بیچنے والا بھی اس کو زبان سے یا طرزِ عمل سے منظور کرے تو پھر اس تفصیل میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں، بلکہ یہی نئی قیمت ہی ثمن قرار پائے گی۔

چنانچہ "شرح التنویر" میں ہے:

(وإذا أوجب واحد قبل الآخر) بائعا كان أو مشتريا في المجلس) لأن خيار القبول مقيد به (كل المبيع بكل الثمن، أو ترك) لئلا يلزم تفريق الصفقة (إلا إذا) أعاد الإيجاب والقبول

"جب خرید و فروخت کرنے والوں میں سے کوئی ایک ایجاب کرے تو دوسرا (چاہے خریدنے والا ہو یا فروخت کنندہ، اگر وہ قبول کرنا چاہے تو اس کو) مجلس کے اندر اندر پورے مبیع کو

پوری قیمت کے ساتھ قبول کرنے کا اختیار حاصل ہے یا قبول
ہی نہ کرے تاکہ تفریق صفقہ لازم نہ آئے، البتہ اگر دوبارہ
ایجاب وقبول ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔"[1]

## وصف مرغوب فوت ہو جانے کا حکم

یہی حکم "وصف مرغوب" کا ہے کہ اگر مشتری خریدتے وقت کسی خاص وصف کی بنیاد پر خریدے اور ایجاب وقبول کے وقت اس کی صراحت بھی کرے، بعد میں ظاہر ہو جائے کہ مبیع میں وہ وصف موجود نہیں ہے تو ایسی صورت میں بھی مشتری کو بیع فسخ کرنے یا برقرار رکھنے کا اختیار حاصل ہو گا، کیونکہ اس خاص وصف کے بغیر خریدنے میں اس کی رضامندی یقینی نہیں، اسی کو فقہاء کرام "خیار فوات وصف مرغوب" سے تعبیر فرماتے ہیں۔

## پانچواں اور آخری ضابطہ:

جب ایک شخص کوئی چیز خریدے اور خریدنے کے بعد وہ چیز اس کے بتائے ہوئے معیار پر پوری نہ اترے، بلکہ جو کچھ اس نے لین دین کے وقت طے کیا تھا، مبیع اس کے خلاف ہو، تو اس میں کل تین طرح کی غلطی ہو سکتی ہے۔

## جنس کی غلطی:

---

[1] شرح التنویر، کتاب البیوع، ٤ / ٥٢٥۔

کہ خرید وفروخت میں ایک چیز طے کی جائے اور خریدار کو دوسری چیز حوالہ کی جائے، مثلاً غلہ کا ایک ڈھیر پڑا تھا، مالک نے سمجھا کہ گندم ہے اور اسی خیال پر عمر کو پورا ڈھیر بیچ دیا خریدار نے بھی گندم سمجھ کر خریدا، لیکن دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کو گندم نہیں بلکہ جو ملا ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ دوسری جنس میں بیع منعقد ہی نہیں ہوگی کیونکہ بیع کا تعلق ایجاب وقبول کے ساتھ ہے (جیسا کہ ضابطہ نمبر ا میں ذکر ہوا) جس میں دوسرے جنس کا ذکر تک نہیں۔

**اوصاف میں تفاوت:** جب خریدار کو مخصوص صفات کی چیز چاہئے تو وہ عقد کے وقت اس صفت کا تذکرہ کرتا ہے مثلاً کسی مصروف شخص کو اپنے کام نمٹانے کے لئے کاتب کی ضرورت ہے، اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ بازار گیا اور کسی سے غلام خریدا، خریدتے وقت یہی طے پایا کہ یہ غلام کاتب ہے۔

بیع وغیرہ ہوچکنے کے بعد معلوم ہوا کہ غلام بے چارہ کتابت سے بالکل واقف نہیں، یا کچھ نہ کچھ جانتا تو ہے لیکن اس حد تک مہارت حاصل نہیں جس کی وجہ سے اس کو عام معاشرے میں کاتب کہا جاسکے، اب کیا حکم ہوگا؟

تو اس صورت حال پر اگر غور کیا جائے تو خریدا بھی غلام اور ملا بھی غلام، دونوں کا جنس ایک ہی ہے تاہم خریدار کی مطلوبہ صفات موجود نہیں ہیں۔

اس کا حکم یہ ہے کہ بیع درست ہوجائے گی تاہم چونکہ ممکن ہے کہ ایک جنس کے باوجود خریدار کا مقصد اس سے پورا نہ ہو رہا ہو اسلئے یہ بیع لازم نہیں ہوگی، بلکہ خریدار کو اختیار ہے اگر چاہے تو بیع نافذ کرنے دے ورنہ تو فسخ کرے۔

لیکن اس کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ غلام کو بھی اپنے پاس رہنے دے اور "کتابت" کی وجہ سے جو زیادہ قیمت خرچ ہوئی تھی، وہ واپس وصول کرے، کیونکہ "کتابت" زیادہ سے زیادہ ایک وصف مرغوب ہے اور صفت چونکہ کوئی مادی جوہر نہیں جس کو مستقل طور پر خریدا جا سکے،اس لئے اس کے عوض میں مستقلاً کوئی قیمت بھی نہیں آئیگی۔

## مقدار کا فرق:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنس بھی وہی ملتا ہے اوصاف بھی مکمل ہوتے ہیں، البتہ مقدار وہ نہیں مل پاتی جو عقد کے وقت متعین کی گئی تھی، مثلاً کسی نے تین من گندم خریدا، بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو دو من ہی ہاتھ آئے، تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا جنس کی تبدیلی کی طرح اس کی وجہ سے بھی بیع سرے سے منعقد ہی نہیں ہوگی یا اس کا حکم اوصاف کے حکم جیسا ہے کہ بیع منعقد تو ہو لیکن خریدار کے حق میں لازم نہ ہو؟

اگر غور کیا جائے تو جنس کی اہمیت زیادہ ہے، اگر کسی چیز کی جنس ہی بدل جائے تو اس سے متعلقہ مقاصد بالکل ہی فوت ہو جاتے ہیں۔ کتاب اور کاپی دو مختلف اجناس ہیں، کاپی سے وہ کام نہیں لیا جا سکتا جو کتاب سے لیا جاتا ہے، اگر خریدار کو کاپی کے بجائے کتاب ہاتھ آجائے تو اس کا کام اس سے پورا نہیں ہوگا، اس کے باوجود اگر اس کو کتاب خریدنے اور رکھنے پر مجبور کر دیا جائے تو یہ درست نہیں ہوگا۔

لیکن مقدار کا یہ حال نہیں، چاول اگر تین کے بجائے دو من ہوں تو بھی اس سے کھانے کھلانے کا کام لیا جاسکتا ہے گو پہلے سے کم سطح پر، کسی حد تک ضرورت کی تکمیل ہو ہی جاتی ہے، اس فرق کی وجہ سے مقدار پر جنس کا حکم لگا دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔

جنس کے بعد ایک چیز "وصف" رہ جاتی ہے، اگر مقدار کا اس کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو مقدار کی اہمیت اس کے مقابلے میں زیادہ ہے، کوالٹی اور معیار کے کم ہونے کے باوجود ضرورت پوری ہو جاتی ہے لیکن مقدار کے کم ہونے کی صورت میں مقصد مکمل طور پر پورا نہیں ہوتا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقدار کی اہمیت وصف سے زیادہ ہے، اسلئے اس پر وصف کے احکامات منطبق کرنا بھی بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا۔

نیز وصف کا حکم جاری نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اوصاف کے مقابلے میں مستقلاً ثمن نہیں آتا، اگر خریدا ہوا سامان مقررہ اوصاف کا حامل نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ خریدار کو عقد برقرار رکھنے یا فسخ کرنے کا اختیار مل جاتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے قیمت میں کمی نہیں کی جاسکتی، اگر خریدار سودا برقرار رکھنا چاہے تو قیمت وہی کی وہی رہے گی۔

لیکن مقدار کا معاملہ اس کے برعکس ہے، کیونکہ مقدار عام طور پر ایک مستقل عین ہوتا ہے جو ثمن کے عوض خریدا اور بیچا جاتا ہے، اسلئے اگر خریدار کو مطلوبہ مقدار سے کم سامان ملے تو اس میں تفریقِ صفقہ کا ضابطہ جاری ہوگا جس کی تفصیل اوپر ذکر ہو چکی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر جنس کے ساتھ مشابہت کی رعایت رکھی جائے تو بیع منعقد ہی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ بیع مثلاً دس کلو کی ہوئی ہے، نو اور گیارہ کلو کا عقد نہیں ہوا، گویا یہ تینوں مختلف اجناس ہیں، اسلئے یہ بیع درست ہی نہیں ہوئی، اور اگر اس بات کو مد نظر رکھا جائے کہ حقیقت میں جنس تو وہی ہے جو عقد کرتے وقت طے کی گئی تھی، فرق صرف اتنا ہی ہے کہ طے دس کلو ہوا تھا اور ملا نو یا گیارہ کلو، مقدار کی کمی بیشی وصف مرغوب کے مترادف ہے تو اس کے پیش نظر بیع منعقد ہونی چاہئے، تاہم چونکہ کمی بیشی کی صورت میں کسی ایک فریق کو ضرر پہنچنے کا احتمال ہے اسلئے اس کو اختیار ملنا چاہئے۔

## شوافع اور حنابلہ کا موقف

حضرات شوافع اور حنابلہ میں سے بہت سے فقہاء کرام نے پہلی توجیہ کو اختیار کیا اور انہوں نے اس بیع کو باطل قرار دیا، اور حنابلہ میں سے اکثر فقہاء کرام یہی دوسری توجیہ اختیار کرتے ہیں، علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے یہ مسئلہ ذکر فرمایا ہے[1]۔

---

[1] دیکھئے المغنی لابن قدامہ، کتاب البیوع، ج ٦ ص ٢١٠، وزارۃ شئون المطبوعات۔

فقہاء شافعیہ میں سے امام سبکی رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام شیرازی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب "المہذب" کی شرح میں اس پر نہایت تفصیل سے کلام فرمایا ہے۔ (تکملۃ المجموع شرح المہذب، کتاب البیوع، باب بیع المصراۃ والرد بالعیب، ج ١٢ ص ٣١٧)

ان حضرات کے نقطہ نظر میں جزوی اختلافات موجود ہیں لیکن مجموعی طور پر سب اس بات پر تقریباً متفق ہیں ،چند مخصوص اصولوں کی روشنی میں یہ حضرات اس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔

فقہاءِ احناف رحمہم اللہ تعالیٰ نے مقدار کے مختلف صورتوں کی جو تفصیل کی، جس کی بناءپر اصل اور وصف کے احکام مختلف ہوگئے، یہ تفصیل ان حضرات (فقہاء شافعیہ وغیرہم) کے ہاں موجود نہیں۔

فقہاءِ احناف کا نقطہ نظر تفصیل سے آئندہ اوراق میں ذکر کیا جاتا ہے۔

## اصل مسئلہ اور فقہاء کرام کے عبارات کی وضاحت:

ان تمہیدات کے بعد مختصر طور پر متعلقہ فقہی عبارات کی توضیح و تشریح کی جاتی ہے، گفتگو میں ضبط و ترتیب برقرار رکھنے اور آسانی پیدا کرنے کے لئے پورے بحث کو مندرجہ ذیل چار ابواب کے اندر تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔اصل اور وصف کی توضیح اور ان اصطلاحات کے مقرر کرنے کی بنیاد کیا ہے؟

۲۔مکیلی یا موزونی اشیاء کی خرید و فروخت میں اگر "اصل" کم یا زیادہ نکلیں تو اس کا حکم اور اس کی دلیل؟

۳۔ گز کے ساتھ بکنے والی اشیاء اگر مطلوبہ مقدار سے کم یا زیادہ نکلیں تو اس کا حکم؟

۴۔موجودہ زمانے کا عرف اور اس کے مطابق فقہی حکم؟

## اصل و وصف کی توضیح:

متقدمین اور متاخرین تقریباً تمام فقہاءِ حنفیہ نے اپنی اپنی کتابوں میں اس مسئلہ کو ذکر فرمایا ہیں اور تقریباً سب حضرات نے اصل اور وصف کی بنیاد پر اس کو حل کیا، امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی الجامع الصغیر اور کتاب الاصل میں اس کو

مختصراً ذکر فرمایا ہے لیکن آپ نے باقاعدہ اصل اور وصف کے اصطلاحات استعمال نہیں فرمائے۔

آپ "کتاب الاصل" میں تحریر فرماتے ہیں:

وإذا اشترى شيئا مما يكال أو يوزن صفقة واحدة فاستحق بعضه فإن له أن يترك ما بقي ولا يأخذه أن استحق قبل القبض، وكذلك إن وجد ناقصاً فله أن يتركه وإن شاء أخذه بحصته من الثمن، فإن كان اشترى عدل زطي بثمن واحد فوجده ناقصا أو زائدا فلا خير في البيع، وله أن يرده، وإن سمى لكل ثوب ثمنا فلا خير فيه إذا كان زائدا؛ لأن الذي وقع عليه البيع في هذا مجهول لا يعرف، وإن كان ناقصا فعلم بذلك قبل أن يقبض أو بعد ما يقبض فهو بالخيار إن شاء ترك وإن شاء أخذ ما بقى بما سمى لكل ثوب من الثمن، وإذا اشترى الرجل كر حنطة بخمسين درهما فوجده ناقصا إن شاء أخذه بحصته من الثمن؛ لأن هذا يعرف ما يصيبه من الثمن فليس هذا كالعروض التي ثمنها جملة واحدة

"جب کوئی شخص کسی مکیلی یا موزونی چیز کو ایک ہی صفقہ میں خریدے، خریدنے کے بعد اس چیز کے ایک حصے کا کوئی مستحق نکلے اور ابھی تک خریدار نے مبیع کو قبضہ نہ کیا ہو تو اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس حصے کا مستحق نہ بھی نکلا اس کو بھی چھوڑے

اور اس کو منظور نہ کرے۔اسی طرح اگر مبیع مقررہ مقدار سے کم ہو تو بھی اس کو اختیار ہے اگر چاہے تو نہ خریدے اور اگر خرید نا چاہے تو جتنی چیز موجود ہو، اسی کے برابر ثمن کے ساتھ خریدے۔

اگر کسی نے زطی کپڑے کی گھٹڑی ایک ہی ثمن میں خریدی (یعنی پوری گھٹری کی صرف مجموعی قیمت مقرر کی، ہر ہر کپڑے کی الگ کوئی مستقل قیمت طے نہیں ہوئی) اور پھر وہ طے شدہ مقدار سے کم یا زیادہ نکلا تو اس بیع میں کوئی خیر نہیں ہے اور خریدار کو اختیار ہے اگر اس کو واپس کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اور اگر ہر ہر کپڑے کی علیحدہ قیمت مقرر ہوئی تھی (پھر کچھ کپڑے زیادہ نکلے) تو بھی اس معاملہ میں کوئی خیر نہیں ہے کیونکہ بیچے ہوئے کپڑے مجہول اور نامعلوم ہیں، اور اگر اسی صورت میں کپڑے زیادہ نکلنے کے بجائے کم نکلے (یعنی مثلاً طے یہ ہوا تھا کہ گھٹری میں دس کپڑے ہیں اور بعد میں معلوم ہو جائے کہ کل کپڑے نو ہیں) چاہے گھٹڑی کو اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے معلوم ہو جائے یا اس کے بعد پتہ چلا تو (دونوں صورتوں میں) خریدار کو اختیار ہے اگر چاہے تو چھوڑ دے اور اگر چاہے تو موجودہ کپڑے کو اس کے مطابق قیمت پر خریدے (لہٰذا اگر نو

کپڑے ہیں اور فی کپڑا ایک درہم قیمت مقرر ہوئی تھی تو نو روپے پر خریدے)۔

اگر کسی نے گندم کی ایک خاص مقدار مثلاً پچاس من کو پچاس درہم میں خرید ا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مطلوبہ مقدار سے کم ہے تو خریدار کو اختیار ہے اگر چاہے تو موجودہ گندم کو اس کے مطابق قیمت دے کر خریدے ، (اس صورت میں بیع کو ختم کرنا ضروری نہیں) اس لیے کہ اس میں موجودہ مقدار کی قیمت بھی معلوم ہے ، لہٰذا یہ اس سامان کی طرح نہیں ہے جس کی مجموعی قیمت ہی (معلوم ہوسکتی) ہے (اور مبیع کے ہر ہر جز پر اس کی قیمت تقسیم نہیں ہوتی۔)۔[1]

یہاں تو ان اشیاء کا حکم ذکر فرمایا جو مکیلی یا موزونی ہیں، جو چیزیں گز کے ساتھ بیچی جاتی ہیں جن کو مذروعات کہا جاتا ہے، ان کا حکم آپ نے "الجامع الصغیر" میں بیان فرمایا ہے۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

رجل اشترى دارا على أنها ألف ذراع فوجدها أكثر فهي كلها له، ولو اشتراها على أنها ألف كل ذراع بدرهم فزادت فهو بالخيار إن شاء أخذها وزاد في الثمن بحساب

---

[1] كتاب الأصل، كتاب البيوع،قبيل باب المرابحة،٢/٤٧٥

ذلک وإن شاء ترکھا، وإن نقصت أخذھا بحصتھا إن شاء، وقال یعقوب ومحمد: الثوب بمنزلۃ الدار

"ایک آدمی نے اس شرط پر گھر خریدا کہ یہ ہزار گز ہے پھر اس کو ہزار گز سے زیادہ گز کا پایا تو پورا ہی گھر اسی کا ہوگا،اور اگر اس شرط کے ساتھ خریدا کہ ہزار گز ہیں ہر گز ایک درہم کا ہے، پھر گھر زیادہ گز کا نکلا تو اس صورت میں خریدار کو اختیار حاصل ہے، اگر چاہے تو پورا گھر خریدے اور قیمت میں اسی کے اعتبار سے اضافہ کرے اور اگر چاہے تو نہ خریدے، اور اگر گھر مقررہ گزوں سے کم کا نکلا تو اس صورت میں اگر چاہے تو اسی موجودہ گزوں کے حساب سے خرید لے، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ نے فرمایا کہ کپڑا بھی گھر کے حکم میں ہے (جو حکم گھر کا اس عبارت میں ذکر ہوا وہی حکم کپڑے کا بھی ہے)۔[1]

ان دونوں عبارات کو ملانے سے مکیل وموزون اورذراعی اشیاء کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے، اور مسئلہ کی کیفیت تقریباً وہی بن جاتی ہے جو متاخرین فقہاء کرام نے ذکر فرمائی ہے۔

[1] الجامع الصغیر، کتاب البیوع، باب البیع فیما یکال أو یوزن، ص ۱۷۱

فرق صرف اتنا ہے کہ امام محمدؒ کے کلام میں باقاعدہ اصل اور وصف کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی جبکہ متاخرین فقہاء کرام نے آپ ہی کے مندرجہ بالا کلام کی شرح کرتے ہوئے توضیح و تشریح کیلئے ان اصطلاحات کو بھی استعمال فرمایا۔

مسئلہ کی دونوں صورتوں میں اگرچہ بظاہر مکیلی و موزونی اور مذروعی اشیاء کے درمیان مندرجہ بالا فرق معلوم ہوتا ہے، اور مکیلی موزونی الفاظ کے استعمال کرنے سے بھی بظاہر یہی مفہوم ذہن میں آتا ہے کہ دونوں صورتوں میں فرق مکیلی اور موزونی ہونے کی وجہ سے ہی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام موزونات ومکیلات اور مذروعات میں اس فرق کو برقرار رکھا جائے۔

## امام محمد رحمہ اللہ کی ذکر کردہ علت

لیکن پہلی صورت میں دلیل بیان کرتے ہوئے آپ کے الفاظ " لأن هذا يعرف ما يصيبه من الثمن فليس هذا كالعروض التي ثمنها جملة واحدة" سے بالکل واضح ہوتا ہے کہ مسئلہ کی اصل بنیاد اسی بات پر ہے جو ضابطہ نمبر ۳ میں تحریر کیا جاچکا، فی نفسہ مکیلی و موزونی ہونا یا گز کے ساتھ بک جانے پر مسئلہ کا دار و مدار نہیں بلکہ مسئلہ کی بنیاد اس عقدہ کے حل کرنے پر ہے کہ مبیع کے مختلف اجزاء پر مجموعی ثمن تقسیم ہوتی ہے یا نہیں؟ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے شارحین نے اسی بات کو دوسرے انداز میں سمجھانے کی کوشش فرمائی، جس میں اصل اور وصف کے اصطلاحات پیدا ہوگئے، اور بعد میں یہی اس مسئلہ کا عنوان بن گیا۔

## علامہ ابن مازہ بخاری کی تشریح

علامہ ابن مازہ البخاری رحمہ اللہ کے کلام سے اس کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے، "الجامع الصغیر" کے حوالے سے امام محمد رحمہ اللہ کی جو عبارت اوپر درج ہوئی، آپ اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

أصل هذا أن الذراع فيما يذرع يشبه الأوصاف، فإن الإسم لا يتغير بزيادة الذرع ونقصانه، بل يتغير وصفه، فيصير أطول وأقصر، ولكنه غير منتفع به يزداد القيمة بزيادته، فمن هذا الوجه أصل، فيجب العمل بالشبهين في حالين، وإذا لم يقابل الثمن بالذرعان يراعي فيه شبه الأوصاف، فيستحق تبعاً لاستحقاق الأصل، وإن لم يتناوله العقد كفناء الدار يستحق من غير ذكر. وكجمال الجارية يستحق من غير ذكر، وإذا اعتبر وصفاً، فإن زاد سلم المشتري من غير خيار، وإن انتقص تخير المشتري، ولكن لا يحط شيء من الثمن كمالو سقط أطراف المبيع، فإن هناك يتخير المشتري، ولا يسقط شيء من الثمن كذا ههنا.

وإذا قابل الثمن بالذرعان بأن قال: كل ذراع بكذا يراعي فيها شبه الأصالة، ويصير كل ذراع بمنزلة مبيع على حدة، فإن ازداد يخير المشتري؛ لأنه يقع تسوية ضرر؛ لأنه إن ازداد المبيع يلزمه زيادة ثمن، فيتخير المشتري، وإن

انتقص تخير المشتري أيضاً؛ لأنه يقع تسوية ضرر؛ لأنه إن انتقص المبيع.

"اصل قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز ناپ کر فروخت ہوتی ہے، اس میں گزاوصاف کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے کیونکہ ذراع (گز) کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے کسی چیز کا نام تغیر پذیر نہیں ہوتا بلکہ صرف وصف تبدیل ہوتا ہے یعنی گز کی زیادتی سے کپڑا لمبا اور کمی کی وجہ سے چھوٹا ہو جاتا ہے۔۔(جب گز ایک اعتبار سے اصل کے مشابہ ہے اور دوسرے اعتبار سے وصف کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے) تو ان دونوں مشابہت پر دو مختلف صورتوں میں عمل کرنا ضروری ہے۔

جب ثمن کا تبادلہ گزوں کے ساتھ ہو تو اوصاف کے مشابہت کی رعایت رکھی جائے گی۔۔۔(جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ )اگر گھر کو فروخت کرنے کی صورت میں معلوم ہو جائے کہ گز مقررہ تعداد سے زیادہ ہے، تو زیادہ گز بھی خریدنے والے کے ہوں گے جس میں اس کو کوئی اختیار نہیں ہوگا، اور اگر اس میں کمی آجائے تو خریدنے والے کو گھر خریدنے اور نہ خریدنے کا اختیار ہوگا مگر وصف کی اس کمی کی وجہ سے قیمت میں کوئی کمی نہ ہو گی۔۔۔اور جب ثمن کا تبادلہ گزوں کے ساتھ کیا جائے اور فی گز قیمت مقرر کی جائے تو ایسی صورت میں اصل کے ساتھ

مشابہت کی رعایت رکھی جائے گی اور اس صورت میں ہر ہر گز
علیحدہ مبیع کے مانند ہو گا، لہٰذا اگر معلوم ہو جائے کہ مبیع میں
مقررہ مقدار سے زیادہ گز ہیں تو (یہ زیادہ گز خریدار کو بلا عوض
نہیں ملیں گے بلکہ فی گز قیمت دینی ضروری ہو گی تاہم) اس کو
لینے اور نہ لینے کا اختیار حاصل ہو گا۔"[1]

امام محمد اور علامہ ابن مازہ رحمہما اللہ کے مندرجہ بالا عبارات میں غور کرنے سے دونوں کے انداز بیان کا فرق معلوم ہو جاتا ہے، اس کے بعد کے مصنفین فقہاء کرام نے اس مسئلہ کو اسی انداز اور ان ہی اصطلاحات کے ساتھ اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کرنا شروع فرمایا۔ کئی سو سال چونکہ ایک طویل زمانہ ہے جس میں افہام وتفہیم کے اسالیب وانداز کا بدل جانا ایک طبعی امر تھا اسلئے ہر فقیہ نے
اپنے زمانے اور ماحول کے مطابق آسان سے آسان تر ڈھنگ سے سمجھانے کی کوشش فرمائی جس کی وجہ سے اصل اور وصف کی تعریفات میں بھی اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ فقہ حنفی کی تقریباً ہر جامع کتاب میں اس کے تین تین چار چار تعریفات ذکر ہوں گی۔

---

[1] المحيط البرهاني في الفقه النعماني، كتاب البيوع، الفصل السادس: فيما يجوز وما لا يجوز بيعه، ٩/ ٣٦٣۔

## مسئلے کی اصل بنیاد:

لیکن مسئلہ کا دار و مدار وہی نکتہ تھا جس کی طرف امام محمد رحمہ اللہ کا کلام اشارہ کر رہا تھا، جس کا خلاصہ یہی ہے کہ جس چیز کی مجموعی قیمت اس کے افراد اور اکائیوں پر تقسیم ہوتی ہو اس میں اگر کوئی کمی وبیشی واقع ہو جائے تو اس کا حکم وہی ہوگا جو مکیلی وموزونی کا ذکر ہے (جو آخر میں ذکر ہوگا انشاءاللہ)۔

اور اگر وہ چیز ایسی ہو کہ جس کے اجزاء وافراد آپس میں ایک دوسرے کے بالکل مماثل نہ ہوں کہ جس کی وجہ سے مجموعی قیمت اس کے حصص پر تقسیم ہو سکے تو ایسی صورت میں اگر مبیع طے شدہ مقدار سے کم یا زیادہ نکلے تو اس کا حکم وہی ہوگا جو کپڑا خریدنے کے ضمن میں بیان ہو چکا۔

جب حکم کی اصل بنیاد واضح ہوگئی تو اب اس بات کی تحقیق کرنی ضروری ہے کہ ایسی کون کونسی اشیاء ہیں جن کی مجموعی قیمت سے ہر ہر جزء کی قیمت معلوم کی جاسکتی ہے؟ اور کن چیزوں کے تمام اجزاء وافراد کی قیمت مجموعی قیمت سے معلوم نہیں کی جاسکتی؟ ان دونوں قسم کی چیزوں میں یہ تفاوت کیوں ہے؟

اس سوال کے جواب کیلئے جب ہم مختلف چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں، لوگوں کے لین دین اور مختلف اشیاء کی خرید وفروخت کے طور وطریقوں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو بالاخر یہی جواب ملتا ہے کہ اس باب میں عرف کا قوی دخل ہے، بلکہ زمانے کے عرف اور معاشرہ کی روش ہی سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کن اشیاء کی مجموعی قیمت اس کے مختلف اجزاء پر منقسم ہوتی ہے اور کن کی نہیں؟ یہ کوئی

منصوص مسئلہ نہیں جو اپنی جگہ مستقل اور منضبط رہے بلکہ لوگوں کے تعامل ہی سے کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

تو گویا اس مسئلہ کا مدار زمانے کا عرف ہی ہے، چنانچہ امام اکمل الدین بابرتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان اصطلاحات اور اصل و وصف کے بنیاد پر اس فرق کو اولاً فقہ کا مشکل ترین مسئلہ قرار دیا۔

دونوں صورتوں کے حکم میں فرق کرنے پر اشکال نقل کیا پھر اس کا جواب بھی ذکر کیا، بعد میں خود ہی وضاحت کرتے ہوئے یہی بات ارشاد فرمائی کہ یہ دراصل تاجروں کا تعامل ہی ہے جس کی بنیاد پر بعض چیزوں کو "اصل" اور بعض دیگر اشیاء کو "وصف" کا مقام حاصل ہوا۔

## علامہ بابرتی کی عبارت

صاحب ہدایہ رحمہ اللہ نے جس عبارت میں یہ مسئلہ ذکر فرمایا آپ اس کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

واعلم أن هذه المسألة من أشكل مسائل الفقه، وقد منع أن يكون الذراع في المذروعات وصفا، والاستدلال بقوله، ألا ترى أنه عبارة عن الطول والعرض غير مستقيم. لأنه كما يجوز أن يقال شيء طويل وعريض يقال شيء قليل أو كثير، ثم عشرة أقفزة أكثر من تسعة لا محالة، فكيف جعل الذراع الزائد وصفا دون القفيز؟ وجوابه موقوف على معرفة اصطلاح القوم في الأصل والوصف، واختلفت عباراتهم في ذلك فقال بعضهم: ما

تعيب بالتنقيص فالزيادة والنقصان فيه وصف،وما ليس كذلك فالزيادة والنقصان فيه أصل. وقال بعضهم: ما لوجوده تأثير في تقدم غيره ولعدمه تأثير في نقصان غيره فهو وصف، وما ليس كذلك فهو أصل. وقيل ما لا ينقص الباقي بفواته فهو أصل، وما لا يكون كذلك فهو وصف، وهو قريب من الثاني. والمكيل لا يتعيب بالتبعيض، والمذروع يتعيب، وعشرة أقفزة إذا انتقص منها القفيز فالتسعة تشترى بالثمن الذي يخصها مع القفيز الواحد فيما إذا قال اشتريت هذه الصبرة بعشرة دراهم على أنها عشرة أقفزة، وأما الذراع الواحد من الثوب أو الدار إذا انتقص فإن الباقي لا يشترى بالثمن الذي كان يشترى معه، فإن الثوب العتابي إذن مثلا إذا كان خمس عشرة ذراعا فالخمسة الزائدة على العشرة تزيد في قيمة الخمسة وفي قيمة العشرة أيضا. وإذا عرف هذا عرف أن القلة والكثرة من حيث الكيل أو الوزن أصل ومن حيث الذرع وصف، وهو اصطلاح يقع على ما هو المتعارف بين التجار.

"جان لو: کہ یہ مسئلہ فقہ کے مشکل ترین مسائل میں سے ایک ہے، یہ بات تسلیم نہیں کی جاتی کہ گز کے ذریعے فروخت کی جانے والی اشیاء میں گز وصف ہے، اس پر یہ استدلال کرنا کہ گز تو بس طول و عرض ہی کا نام ہے، درست نہیں، کیونکہ جس طرح کسی

چیز کو طویل و عریض کہا جاتا ہے، اسی طرح قلیل و کثیر بھی کہا جاتا ہے اوراس کے مطابق دس قفیز نو قفیز سے یقیناً زیادہ ہے، تواس کے باوجود صرف گزہی کو کیونکر وصف قرار دیا گیا؟۔

اس اعتراض کا جواب حضرات فقہائے کرام کی (اس) اصطلاح سمجھنے پر موقوف ہے (جو اصل اور وصف کے حوالے سے ان حضرات کے درمیان متعارف ہے)، اس کے متعلق حضرات فقہاء کرام کے مختلف تعبیرات ہیں۔۔۔جب فقہائے کرام کی یہ اصطلاح معلوم ہوگئی تواس سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ کسی چیز کی کمی یا زیادتی اگر تول یا وزن کے اعتبار سے ہو تو یہ "اصل" ہے اور اگر گز کے ذریعے ہو تو "وصف"، یہ ایک اصطلاح ہے جو (اس وقت کے) تاجروں کے عرف کے (بالکل) مطابق ہے۔"[1]

عبارت کے آخری الفاظ **"وهو اصطلاح يقع على ما هو المتعارف بين التجار"** نے مسئلہ کی اصل بنیاد بالکل واضح کر دی کہ مختلف اشیاء میں کیل یا وزن کا اصل کہلانا اور ذرع کا وصف قرار دیا جانا دراصل بازار کے عرف اور لوگوں کی عادت ہی پر موقوف ہے۔

---

[1] العناية شرح الهداية (كتاب البيوع، ٦ / ٢٧٢)

## علامہ بدرالدین عینی کا تجزیہ

ہدایہ ہی کے ایک اور شارح مشہور حنفی فقیہ و محدث علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ نے اپنی شرح "البنایہ" میں اس مقام کی توضیح میں اصل اور وصف کی مختلف تعریفات نقل کی ہے جو وہی ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے، بعد میں اس پر مختلف اشکالات کر کے آخر میں یہی نتیجہ نکالا ہے کہ یہ دراصل اس زمانے کا عرف ہے، لوگ ذراع کے ساتھ وصف اور کیل ووزن کے ساتھ اصل والا معاملہ کرتے ہیں، اسلئے مسئلہ کے دونوں صورتوں کے احکام مختلف ہوگئے۔

آپؒ فرماتے ہیں:

قلنا: بل إن القلة والكثرة من حيث الكيل والوزن كان أصلا، ومن حيث الذرع كان وصفا لدخولهما تحت الحدود التي ذكرنا في التفرقة بين الأصل والوصف، فإنه زيادة شبر واحد مثلا على العشرة يوجب زيادة قيمة العشرة، مع أن وصف الكثرة والقلة حصل به؛ لأن الكثرة بكثرة الدخول بخلاف الذرع، فإن زيادته توجب زيادة قيمة لم تكن لها بدون ذلك الذرع، وهذا متعارف بين التجار فكان الذرع وصفا.

"کیل اور وزن کے اعتبار سے کسی چیز میں کمی یا زیادتی "اصل" ہے اور ذراع کے اعتبار سے" وصف" کیونکہ یہ دونوں ان

تعریفات کے ضمن میں داخل ہیں جو ہم اصل اور وصف کے درمیان فرق بیان کرنے کے سلسلے میں ذکر کر چکے۔۔۔[1]

## آدھے گز کی کمی اور زیادتی کا مسئلہ

اسی مسئلہ کی ایک شق یہ بھی ہے کہ اگر خریدتے وقت ہر گز کے بدلے مستقل قیمت مثلاً ایک درہم مقرر کر لی جائے اور یہ طے ہو جائے کہ دس گز کپڑا ہے ہر گز ایک درہم پر ہے، تو ایسی صورت میں اگر کپڑا مطلوبہ مقدار سے کم یا زیادہ نکلے اور یہ کمی یا زیادتی نصف ذراع سے کم ہو مثلاً ساڑھے نو یا ساڑھے دس گز کپڑا ہو، تو کیا حکم ہو گا؟

اس میں ائمہ احناف ؒ کا اختلاف ہے، امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جزء کو کل پر قیاس کیا جائے یعنی جو حکم پورے گز کے کم یا زیادہ نکلنے کا ہے وہی آدھے گز کم یا زیادہ نکلنے کا بھی ہے، اور یہی قیاس کا بھی تقاضا ہے کہ جب ذراع کو وصف قرار دیا گیا اور زیادہ نکلنے کی صورت میں مستقل عوض کے بغیر خریدار کا حق قرار دیا گیا، کم نکلنے کی صورت میں بھی قیمت کو جوں کا توں برقرار رکھا، پورے گز ہونے کی وجہ سے قیمت میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ نو اور دس دونوں کی ایک ہی قیمت مانی گئی، صرف تفرق صفقہ کی وجہ سے خریدار کو فسخ کرنے کا اختیار ملا۔

تو ایسی صورت میں اس قیاس اور قاعدہ کا تقاضا یہ بھی ہے کہ آدھے اور پورے گز میں کوئی فرق نہ کی جائے بلکہ دونوں کو وصف سمجھا جائے اور دونوں کا

---

[1] البنایة شرح الهدایة ، کتاب البیوع، ۸ / ۲۵۔

ایک حکم قرار دیا جائے، جیسا کہ پہلا مسئلہ احناف کی کتابوں میں اتفاقی نقل ہوتا چلا آرہا ہے اسی طرح اس میں بھی اتفاق ہی کا مظاہرہ کیا جائے۔

لیکن ان سب کچھ کے باوجود حضرات طرفین نے حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس مبنی بر قاعدہ اور موافق قیاس قول کے ساتھ اتفاق نہیں فرمایا، اس کی وجہ کیا ہے؟

## علامہ کاسانی کے نزدیک اس اختلاف کی اصل بنیاد

امام علاء الدین کاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حسبِ عادت اس پر روشنی ڈالی ہے، اور اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

والقياس ما قاله أبو يوسف وهو اعتبار الجزء بالكل إلا أنهما كأنهما استحسنا لتعامل الناس؛ فجعل أبو حنيفة زيادة نصف ذراع بمنزلة ذراع تام ونقصان نصف ذراع كلا نقصان؛ لأن الناس في العادات في بياعاتهم و أشريتهم لا يعدّون نقصان نصف ذراع نقصانا بل يحسبونه ذراعا تاما، فبنى الأمر في ذلك على تعامل الناس وجعل محمد الأمر في ذلك على القلب من ذلك لما أن الباعة يسامحون في زيادة نصف على القدر المسمى في البيع عادة ولا يعدونه زيادة؛ فكانت تلك الزيادة ملحقة بالعدم عادة كأنه لم يزد وكذا يسامحون فيعدّون نقصان نصف ذراع في العادات نقصان ذراع كامل؛ فتركنا القياس بتعامل الناس، ويجوز أن يكون

اختلاف جوابهما لاختلاف عادات الناس والله سبحانه وتعالى أعلم

امام ابو یوسف کا قول قیاس کے مطابق ہے کہ جز کو کل کی طرح قرار دیا، لیکن طرفین نے گویا لوگوں کے تعامل کی وجہ سے استحسان سے کام لیا (جس کی تفصیل یہ ہے کہ) حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے آدھے گز کی زیادتی کو پورے گز کی طرح قرار دیا اور آدھے گز کے نقصان کو یوں سمجھا کہ گویا یہ کوئی نقصان ہی نہیں، کیونکہ عام طور پر لوگ لین دین میں آدھے گز کے نقصان کو بالکل نقصان ہی نہیں سمجھتے بلکہ اس کو پورے ہی گز کی طرح خیال کرتے ہیں۔ تو امام صاحبؒ نے لوگوں کے تعامل کی وجہ سے مسئلہ کی بنیاد بھی اس پر رکھی۔

امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے مسئلہ بالکل برعکس کیا کیونکہ دکاندار لوگ عام طور پر آدھا گز دینے میں رعایت سے کام لیتے ہیں اور اس کو زیادہ نہیں سمجھتے، تو لوگوں کے تعامل کو دیکھتے ہوئے یہ زیادتی ایسی ہے کہ گویا کوئی زیادتی ہی نہیں، اسی طرح (دکاندار شخص خریدار کے ساتھ) یہ رعایت بھی کرتے ہیں کہ آدھے گز کی کمی کو پورے گز کی طرح سمجھتے ہیں تو ہم نے لوگوں کے تعامل کی وجہ سے قیاس (کا تقاضا) چھوڑ دیا۔ اور (عین) ممکن ہے کہ ان دونوں حضرات کے جواب کا اختلاف لوگوں

کے مختلف تعامل کی بنیاد پر ہو۔"[1]

اس عبارت نے بڑی واشگاف اور واضح انداز میں مسئلہ کی اصل بنیاد و اساس متعین کردی، علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی اس عبارت پر غور کرنے سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ گز کے مستقل قیمت ہونے یا نہ ہونے کا اصل دارومدار تقریباً تمام حضرات کے نزدیک یہی عرف اور عادت الناس ہی ہے۔

تینوں ائمہ حضرات کے نزدیک مسئلے کی اصل بنیاد یہی ہے البتہ اس کے تطبیق میں آراء مختلف ہوگئیں، اسی کی وضاحت اور مزید انضباط پیدا کرنے کیلئے فقہاء کرام نے اصل ووصف کے اصطلاحات بیان فرمائے اور پھر اس کی تعریفات مقرر فرمائی (جن کو اگر تعریفات کے بجائے علامات کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا)۔

اور نصف ذراع کے کم اور زیادہ ہونے کی صورت میں چونکہ بنیاد ہی مختلف تھی اسلئے قیاس کو ترک کرکے مسئلہ کی اصل بنیاد کے مطابق مسئلہ کا استخراج کیا جس سے اس خاص جزئیہ میں تینوں ائمہ کرام کے مختلف آراء سامنے آگئے۔

---

[1] بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع ، كتاب البيوع، ٣٦٢/٤، مكتبه رشيديه، كوئته)

## علامہ خالد اتاسی کی وضاحت

علامہ محمد خالد الاتاسی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی اس حقیقت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے، آپ فرماتے ہیں:

لأن الذرع إذا لم يكن مقصودا بتناول المبيع له، وصف للمبيع

"جب مبیع سے گز مقصود نہ ہو تو یہ (گز) مبیع کے لیے وصف ہوتا ہے۔"[1]

یہاں ذراع کے وصف ہونے کیلئے "عدم مقصود بتناول المبیع لہ" کی قید لگائی، اور چونکہ کلامِ فقہاء میں مفہوم مخالف حجت ہوا کرتی ہے اسلئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر مقصود بالتناول ہو تو وصف نہیں کہلائیگا۔

اور ظاہر ہے کہ مقصود ہونے یا نہ ہونے کا مدار متعاقدین کے قصد و نیت ہی پر ہے، اور اگر انہوں نے کوئی تصریح نہ کی ہوں، تو عرف وعادت کی وجہ سے اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے، جس کے بہت سے نظائر فقہائے کرام کے کلام میں موجود ہیں۔

## مسئلہ کی تفصیل اور اصل وصف کی تشریح:

فقہائے کرام نے اس مسئلہ کو اصل اور وصف کے اصطلاحات کی بنیاد پر حل فرمایا، اسلئے اولاً ان اصطلاحات سے واقفیت ضروری ہے۔

---

[1] شرح المجلة للعلامة محمدخالد الاتاسي رحمه الله تعالى، ج۲ص۱۳۲ ، مكتبه رشيديه

جیسا کہ اوپر تحریر میں اس طرف اشارہ بھی کیا گیا کہ متاخرین فقہاء کرام نے اصل اور وصف کی مختلف تعریفات کی ہیں جو درا صل تعریفات نہیں، بلکہ ان اصطلاحات کی بنیاد سمجھانے کی مختلف علامات اور نشانیاں ہیں، جو زیادہ واضح اور معتمد تعریف فقہاءِ کرام کے درمیان متداول ہے وہ یہ ہے کہ جو چیز تبعیض و تشقیص سے یعنی ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے معیوب نہ ہوتی ہو اس میں کمیت اور مقدار کو"اصل" کہا جاتا ہے اور جو چیز ایسی نہ ہو یعنی مختلف حصوں میں بانٹنے سے اس میں عیب ونقصان پیدا ہوتا ہو اس کی مقدار "وصف" کہلاتی ہے۔

مثلاً گندم چینی وغیرہ وہ اشیاء جو عام طور پر بازار میں تول کر یا وزن کے ساتھ بکتی ہیں کہ اگر دس من گندم یا چینی کو تقسیم کیا جائے، اور دس کے بجائے سو (۱۰۰) بوریوں میں تقسیم بھی کیا جائے تو بھی اس میں کوئی عیب پیدا نہیں ہوتا، بلکہ معیار وصفات جوں کے توں باقی رہیں گے اور جس مقصد کیلئے پہلے استعمال ہوتے تھے، اب بھی اس کیلئے استعمال ہو سکتے ہیں۔اس کے برخلاف اگر دس گز کپڑا دس اجزاء میں بانٹا جائے تو ان اجزاء کا وہ فائدہ باقی نہ رہے گا جو مجموعے کا تھا جو کام دس گز کے پورے سوٹ سے لیا جا سکتا تھا وہ ایک ایک متفرق گز سے کہاں لیا جا سکتا ہے۔

اسی بات کو کچھ حضرات فقہائے کرام نے ایک اور انداز سے سمجھانے کی کوشش کی کہ اصل وہ ہے جس کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے کمال یا نقصان لازم نہ آئے اور جس چیز کے ہونے یا نہ ہونے سے کمال یا نقصان لازم آئے اس کو وصف کہا جاتا ہے جیسا کہ مندرجہ بالا مثال سے ظاہر ہے۔

بعد کے کچھ فقہائے کرام نے مزید آسانی پیدا کرنے اور سہولت کے ساتھ اصل اور وصف میں تمیز کیلئے ایک اور اصطلاح استعمال فرمائی کہ اصل نام ہے "کمیت منفصلہ" کا اور وصف نام ہے "کمیت متصلہ" کا، چنانچہ علامہ عبد الرحمن شیخی زادہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجمع الانہر میں یہی الفاظ استعمال فرمائے[1] جو کہ کافی متاخر حنفی فقیہ ہیں، ان کی تاریخ وفات ۱۰۸۷ھ ہے۔

لیکن دراصل بات وہی ہے جو شروع میں ذکر کی جاچکی کہ ان تمام تعبیرات اور مختلف قسم کے الفاظ سے مقصود وہی بات سمجھانی ہے جو امام محمد رحمہ اللہ کے مندرجہ بالا کلام سے ظاہر ہوتی ہے، اور جن دو مسائل میں امام محمد رحمہ اللہ نے فرق کیا، ان کے درمیان وجہ فرق بتانی مطلوب ہے۔

خود یہ الفاظ مقصود بالذات نہیں ہیں نہ ہی یہ ایسی کوئی جامع ومانع تعریف ہے جس میں جنس وفصل کے آہنی دروزاے لگا کر ہر ہر لفظ کو قید احترازی قرار دیا جائے۔

مختلف فقہائے کرام نے ان دونوں کی جو مثالیں دی ہیں، ان کی فہرست میں غور کرنے سے اس بات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے (جس کی تفصیل یہاں مقصود نہیں)۔

---

[1] ملاحظہ ہو" مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر، كتاب البيوع، ج٣ ص١٨، مكتبه عمريه بلوچستان

## "اصل" کی صورت میں مبیع کم یا زیادہ نکلنے کا حکم:

اگر کسی شخص نے گندم، چینی وغیرہ وہ اشیاء خریدیں جس میں تبعیض و تشقیص موجبِ عیب نہیں (یعنی اگر اس کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا جائے تو کوئی نقص پیدا نہ ہوتا ہو)، اور پھر معلوم ہوا کہ مقررہ مقدار سے کم یا زیادہ ہے، مثلاً تیس روپے پر تیس کلو گندم خریدی، یہ بات طے ہوئی، بعد میں جب خریدار نے دیکھا تو وہ پینتیس یا پچیس کلو گندم تھا، تو اس کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ:

۱۔ اگر پینتیس (۳۵) کلو گندم نکلا تو اس صورت میں بیع لازم ہے، اور خریدار بائع کو پانچ کلو گندم واپس کرے گا، کیونکہ بیع میں صرف تیس کلو گندم لینا طے ہوا تھا، اور قاعدہ نمبر ا میں تحریر کیا جا چکا کہ بیع کے دوران جس مقدار پر ایجاب و قبول ہوا وہی مبیع شمار ہوگی، اس سے اگر زائد ہو تو چونکہ اس کے بارے میں ایجاب و قبول نہیں ہوا اسلئے وہ مبیع بھی شمار نہیں ہوگا، بلکہ بائع کی ملکیت ہے جو خریدار کے تعدّی کے بغیر اس کے پاس چلی گئی اسلئے اس پر امانت کے احکام جاری ہوں گے۔

۲۔ اگر بعد میں ظاہر ہوا کہ گندم کل پچیس (۲۵) کلو ہے تو اس صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مشتری نے پورا مبیع قبض کیا اور اس کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ مبیع مقررہ مقدار سے کم ہے تو اس صورت میں مشتری کو فسخ کرنے کا اختیار حاصل نہیں، بلکہ رجوع بالنقصان کرے گا یعنی جتنا وزن کم ہوا اس کے برابر ثمن بائع سے واپس لے سکتا ہے لہٰذا مذکورہ مثال میں اس کو دکاندار سے پانچ روپے واپس لینے کا اختیار حاصل ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشتری نے مبیع پر قبضہ نہیں کیا اور یہ بات معلوم ہوئی کہ اس کا وزن کم ہے تو ایسی صورت میں مشتری کو خیارِ فسخ حاصل ہے، اگر وہ چاہے تو موجودہ مبیع کے بقدر قیمت کے ساتھ مبیع خرید لے اور اگر چاہے تو عقد فسخ کرے، لہذا مذکورہ صورت میں مشتری کی مرضی ہے اگر پچیس کلو پچیس روپے پر لینا چاہے یا عقد فسخ کرے، دونوں صورتوں میں وہ خود مختار ہے۔

## مبیع کے قبض کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ پر اثر:

مبیع قبض کرنے اور نہ کرنے کی وجہ سے مسئلہ میں فرق اسلئے ظاہر ہوا کہ مشتری کو حاصل ہونے والا یہ خیار "تفریقِ صفقہ" کی بنیاد پر مل رہا ہے جس کی مکمل تفصیل قاعدہ نمبر ۴ میں گذر چکی، اور تفریقِ صفقہ تب ہی موجب تخییر ہے جب مبیع پر مشتری کا قبضہ نہ آیا ہو، اگر مشتری مبیع کو قبض کرے تو اس کے بعد محض تفریق صفقہ کی بنیاد پر اس کو خیار فسخ حاصل نہیں ہوگا۔

چنانچہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

رجل اشترى عشرة أقفزة فاستحق بعضها قبل القبض خيّر المشتري لتفرّق الصفقة وإن استحق بعد القبض لا يخيّر، وكذا إذا اشترى مكيلا أو موزونا على أنه كرّ فوجده ناقصا جاز البيع في الباقي وهل يخيّر المشتري إن لم يكن قبض المبيع أو كان قبض البعض يخير إن شاء أخذ وإن شاء ترك وإن كان قبض الكل لا خيار له وهو بمنزلة الاستحقاق

"ایک آدمی نے دس قفیز(اس زمانے کا ایک خاص پیمانہ تھا، مثال کے طور پر اس زمانے میں دس سیر گندم) خریدے جن میں سے کچھ سیر گندم استحقاق کی وجہ سے لئے گئے اور مستحق قبضہ کرنے سے پہلے آیا تھا تو "تفریق صفقہ" کی وجہ سے مشتری کو اختیار حاصل ہے۔

اور اگر خریدار کے قبضہ کرنے کے بعد یہی صورت پیش آئی تو اس صورت میں خریدار کو اختیار حاصل نہیں ہو گا۔اسی طرح مکیلی یا موزونی چیز اس شرط پر خرید لی کہ یہ مثلاً ایک من ہے اور بعد میں اس کو کم پایا تو جتنا گندم موجود ہے اس میں بیع جائز ہو جائے گی۔

اس صورت میں کیا مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہو گا یا نہیں؟

تو(اس کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ ) اگر اس نے مبیع پر بالکل قبضہ نہیں کیا یا کچھ پر تو قبضہ کیا لیکن مکمل مبیع پر قبضہ نہیں کیا تو ان دونوں صورتوں میں اس کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ اگر چاہے تو خریدے ورنہ تو چھوڑ دے اور اگر پورے مبیع کو ایک بار

اپنے قبضہ میں لیا ہو تو اس کے بعد کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

یہ مسئلہ بھی بالکل استحقاق کے مسئلہ کی طرح ہے۔"[1]

## صاحبِ نہر کا اشکال

علامہ عمر بن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے "النہر الفائق" میں اس تفصیل پر ایک اشکال کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ قبض کے بعد بھی جب تک مشتری رضامندی کا اظہار نہ کرے تب تک اس کو اختیار ملنا چاہئے، کیونکہ خیار ملنے کی اصل بنیاد "تفریق صفقہ" ہی ہے اور یہ اس صورت میں بھی متحقق ہو سکتا ہے کہ مثلاً مبیع کو مکمل طور پر قبض کرنے کے بعد ہی علم ہو جائے کہ یہ تو مقررہ مقدار سے کم ہے، لہٰذا محض مبیع قبض کرنے کی وجہ سے خریدار کا اختیار کیوں سلب کیا جائے؟

پھر خود ہی دبے ہوئے الفاظ میں اس کا جواب دیا کہ " إلا أن يقال: إنه بالقبض صار راضياً بذلك فتدبره" یعنی اگر قبض کو رضامندی کا قائم مقام ٹھہرایا جائے تو پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ قبض کی وجہ سے گویا وہ اسی پر راضی تھا، اب ایک طرح رضامندی کے بعد اس کا حق ساقط ہو گیا اور اب دوبارہ اس کو خیار حاصل نہیں ہوگا لیکن جواب کا یہ انداز بتا رہا ہے کہ خود علامہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس جواب پر پوری طرح تسلی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ پر اشکال ہنوز باقی ہے۔

---

[1] فتاوی قاضیخان، کتاب البیوع، الفصل الأول في فساد البیع بجهالة أحد البدلين ۲/۲۴۔

## علامہ شامی کی طرف سے اشکال کی تائید اور علامہ اتاسی کا جواب

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس اشکال کو ردالمحتار میں ذکر فرمایا ہے، اور بظاہر آپ کی صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الجملہ اس اشکال سے اتفاق فرمایا۔

لیکن آپ سے ایک متاخر فقیہ اور وسیع المطالعہ متصلب حنفی بزرگ علامہ محمد خالد الاتاسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کے متعلق کتب مذہب کی مختلف عبارات نقل فرمائی، اس کے بعد علامہ شامی رحمہ اللہ کے نقل کئے ہوئے اس اشکال کی تردید فرمائی۔

چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

فما في رد المحتار عن النهر من الاعتراض عليه بأن الموجب للتخيير إنما هو تفريق الصفقة، وهذا القدر ثابت فيما لو وجد بعد القبض ناقصا هـ، لا يلتفت إليه لأنه بحث فلا يصادم المنقول، علي أن ما في الخانية قد أفاد أن تفريق الصفقة إنما يوجب التخيير إذا كان قبل القبض لا بعده كما في مسئلة الاستحقاق

"لہٰذا" ردالمحتار "میں "النہر الفائق" کے حوالہ سے اس مسئلہ پر جو اشکال نقل کیا گیا کہ اختیار دیدینے کی وجہ تو تفریق صفقہ ہے اور یہ اس صورت میں بھی موجود ہے جب کہ قبض کرنے

کے بعد مبیع کو کم پایا، یہ اعتراض قابل توجہ نہیں کیونکہ یہ بحث ہے جو منقول کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔

باوجود اس کے کہ خانیہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ تفریق صفقہ تبھی اختیار دینے کا سبب بن سکتا ہے جب کہ یہ مبیع قبض کرنے سے پہلے ہو نہ کہ بعد میں، جس طرح کہ استحقاق کی صورت میں ہے (کہ اگر مبیع قبض کرنے سے پہلے کوئی بعض مبیع کا مستحق نکل آیا تو خریدار کو اختیار ملے گا ورنہ نہیں)۔[1]

## وصف کی صورت میں مبیع کم یا زیادہ نکلنے کا حکم:

اگر کسی ایسی چیز کی خرید وفروخت ہوئی جس کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے یعنی مختلف حصوں میں تقسیم کرنے سے عیب ونقص لازم آتا ہے، جیسے کپڑا اور زمین وغیرہ، اور بعد میں ظاہر ہو جائے کہ مبیع مقررہ مقدار سے کم یا زیادہ ہے مثلاً ایک شخص نے دوسرے سے کپڑا خریدا، اور طے یہ ہوا کہ یہ پانچ گز کپڑا ہے پانچ سو روپے میں، اور بعد میں پتہ چلا کہ کپڑا چار یا چھ گز ہے تو اس صورت میں تفصیل یہ ہے کہ:

---

[1] شرح المجلة للعلامة محمدخالد الأتاسي رحمه الله تعالى( شرح المادة ٢٢٣، ج٢ص١٢٧، مكتبه رشيديه، كوئته)

۱۔اگر کپڑا چار گز ہو تو خریدار کو اختیار ہے چاہے تو یہی چار گز پانچ سو روپے میں لے لے یا پورا کپڑا واپس کردے، ایسا نہیں کرسکتا کہ چار گز چار سو روپے کے بدلے لے جائے جبکہ مکیلی اور موزونی اشیاء میں اس کو یہ اختیار حاصل تھا۔

دونوں کے درمیان وجہ فرق فقہاء کرام نے یہ تحریر فرمایا کہ کپڑے کے اندر گز کا کم یا زیادہ ہونا وصف ہے اور وصف کے مقابلے میں مستقل طور پر ثمن نہیں آتا اسلئے گز نہ ہونے کی وجہ سے پیسے کم نہیں کرسکتا۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ خریدار کو پانچ گز کا کپڑا مطلوب تھا جو کہ ایک وصف مرغوب ہے، ممکن ہے اس کی ضرورت پانچ گز ہی سے پوری ہوسکتی ہو، چار گز اس کی ضرورت کیلئے کفایت نہ کرتے ہوں، اس لئے اس نے پانچ گز کی قید لگائی تھی اسلئے یہ ایک وصف مرغوب ہوا جس کا حکم یہ ہے کہ اگر خریداری کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ وہ وصف مبیع کے اندر موجود نہیں تو خریدار کو بیع فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

۲۔اگر بعد میں معلوم ہو جائے کہ کپڑا چھ گز ہے تو اس صورت میں بیع لازم ہے، جو زائد گز ہے وہ بلا عوض اور بلا خیار مشتری کا ہے۔

بلا عوض ہونے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ جب اس کا وصف مرغوب ہونا مسلم ہو چکا تو یہ بات تو پہلے سے مقرر ہے کہ اوصاف کے مقابلے میں ثمن نہیں آتی، اسلئے یہ ایسا ہی ہوا کہ کسی نے غلام خریدا اور بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ بہترین کاتب

ہے، اب وصف کتابت کی مستقل عوض وصول کرنا جائز نہیں کیونکہ عوض اعیان کی ہوتی ہے صفات واوصاف کی نہیں۔

یہی وجہ خریدار کو خیار فسخ حاصل نہ ہونے کا بھی ہے کہ جب اس کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، تو خیار کیوں ملے؟

اصل تو بیع میں لزوم ہی ہے خیار تو مخصوص عوارض واعذار کی وجہ سے ملتا ہے جو کہ یہاں مفقود ہے اسلئے مشتری کو خیار فسخ دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

## ایک فقہی اشکال اور اس کا جواب:

یہاں یہ اعتراض نہیں ہونا چاہئے کہ مشتری کو اگرچہ اس میں کوئی نقصان نہیں، مگر ممکن ہے کہ یہ اس کا مقصود نہ ہو مثلاً وہ کسی خاص مصلحت کی بنیاد پر کوئی ایسا غلام تلاش کر رہا ہو جو کتابت بالکل نہیں کر سکتا، تو ایسی صورت میں اگر اس کو کاتب غلام مل جائے تو ظاہر ہے کہ یہ اس کی مصلحت کے خلاف ہے جس کی وجہ سے اس کی رضامندی ختم ہو سکتی ہے، اس لئے اس کو خیار فسخ دیدینا چاہئے۔

## علامہ شیرازی کا جواب

فقہائے شافعیہ میں سے علامہ شیرازی رحمہ اللہ نے اس کا بڑا مختصر جواب دیا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ عقد کے اندر بائع کے خیالات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس چیز کے مارکیٹ کو دیکھا جائے گا، اگر مارکیٹ میں اس چیز کی قیمت بیان کردہ اوصاف کے حامل مبیع سے زائد ہو تو خیار نہیں ملے گا ورنہ فسخ کردینے کا اختیار

حاصل ہوگا، یہاں بھی یہی صورت حال ہے کہ عبد کاتب کی قیمت بازار میں غیر کاتب سے زیادہ ہوتی ہے اسلئے خیار فسخ نہیں ملنا چاہئے۔

ایک مسئلہ کی ضمن میں علامہ شیرازی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وإذا اشترى جارية على أنها بكر فوجدها ثيباً ثبت له الرد لأن الثيب دون البكر وإن اشتراها على أنها ثيب فوجدها بكراً لم يثبت له الرد لأن البكر أفضل من الثيب ومن أصحابنا من قال: يثبت له الرد لأنه قد يكون ضعيفاً لا يطيق وطء البكر فكانت الثيب أحب إليه والمذهب الأول لأنه لا اعتبار بما عنده وإنما الاعتبار بما يزيد في الثمن والبكر أفضل من الثيب في الثمن

"اگر کسی نے لونڈی خریدی اس شرط پر کہ یہ باکرہ ہے پھر اس کو ثیبہ پایا، تو اس کو واپس کرنے کا اختیار حاصل ہے کیونکہ ثیبہ کنواری سے کم تر ہے، اور اگر اس شرط پر خریدا کہ یہ ثیبہ ہے پھر اس کو باکرہ پایا تو اس کو اختیار حاصل نہیں ہوگا کیونکہ باکرہ ثیبہ سے افضل ہے۔

ہمارے بعض فقہاء (شافعیہ) نے فرمایا کہ اس صورت میں بھی اس کو واپس کرنے کا اختیار حاصل ہے کیونکہ ممکن ہے کہ خریدار کمزور ہے کنواری سے جماع کرنے کی طاقت اس میں نہ ہو اور ثیبہ اس کو زیادہ پسند ہو، (یہ دونوں قول ہیں لیکن) پہلا قول ہی مذہب (میں مفتی بہ) ہے کیونکہ خریدار کے عندیہ کا

اعتبار نہیں ہوتا بلکہ اصل اعتبار اس چیز کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے قیمت میں زیادتی ہو جاتی ہو اور چونکہ کنواری ثیبہ لڑکی سے قیمت میں زیادہ ہوتی ہے (اس لئے خریدار کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہو گا)۔"[1]

## فقہاء احناف کا جواب

فقہاء احناف میں سے علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی رحمہا اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو کافی وضاحت کے ساتھ لکھا، ان دونوں حضرات کے تحریر کا حاصل یہ ہے کہ اس باب میں فقہاء احناف کی دو رائے ہیں۔

الف: بعض حضرات کے نزدیک ایسی صورت حال میں خریدار کو اختیار نہیں ملے گا اور اس کی وجہ تقریباً وہی ہے جو علامہ شیرازی رحمہ اللہ کی عبارت میں پہلے ذکر ہو چکی ہے کہ جب مشتری کا اس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے تو خواہ مخواہ اختیار کیوں ملے علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں اسی موقف کو ذکر فرمایا اور اس کی بنیاد پر کچھ تفریعات بھی بیان فرمائی۔

ب: بعض حضرات کے نزدیک ایسی صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ مبیع میں جو وصف اعلی موجود ہے، اس سے خریدار کا مقصد پورا ہو رہا ہے یا نہیں؟ اگر اس وصف کے ہوتے ہوئے خریدار کا مطلوب پورا ہو رہا ہو تو بیع لازم ہو گی اور اس

---

[1] المهذب في فقة الإمام الشافعي للشيرازي (كتاب البيوع، باب بيع المصراة، ٢/٥٥)

کو کوئی اختیار نہیں ملے گا، اور اگر موجودہ وصف کی صورت حال اس سے مختلف ہو یعنی قیمت کے لحاظ سے تو اعلیٰ وصف ہو لیکن خریدار کی غرض کی تکمیل میں کارآمد نہ ہو تو اس کو قبول کرنے اور واپس کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔

## راجح قول

اگر خیارات کے تمام ابواب پر مجموعی طور پر غور کیا جائے تو یہی دوسرا موقف راجح معلوم ہوتا ہے، جس کی ایک گونہ تائید اس بات سے بھی ہو جاتی ہے کہ تقریباً تمام فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وصف اعلیٰ وصف مشروط کے جنس کے خلاف ہو تو اس کی موجودگی کا کوئی اعتبار نہیں اور اس کی وجہ سے خریدار کا اختیار ختم نہیں ہو گا۔

اس قید پر تمام فقہائے کرام کا اتفاق ہے اور بظاہر اس کی بنیادی وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ لین دین میں صرف قیمت یا اچھے اور قیمتی اوصاف منظور نظر نہیں ہوتے بلکہ دونوں جن اغراض و مقاصد کے لئے معاملہ کرتے ہیں، اس کا بھی لحاظ ہونا چاہیئے۔

## علامہ ابن نجیم کی ترجیح

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی رحمہما اللہ تعالیٰ دونوں حضرات نے اسی دوسرے موقف کی تصحیح نقل فرمائی۔ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ اسی باب سے متعلق ایک مسئلہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

وكان المصنف ممن لا يفرّق من المشايخ بين كون الصفة التي ظهرت خيرا من الصفة التي عينت أو لا في ثبوت

الخيار كما أطلق في المحيط ثبوت الخيار، وذهب آخرون منهم صدر الإسلام وظهير الدين إلى أنه إنما يثبت إذا كان الموجود أنقص، وصحّحَ الأول لفوات غرض المشتري[1]

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ اس مسئلہ میں احناف کی دو(۲) آراء ہیں:
بعض مشائخ کے نزدیک صفت کی تبدیلی موجب خیار ہے اگرچہ مبیع میں خریدار کے مطلوبہ وصف سے بہتر وصف موجود ہو، اور بعض فقہاء کے نزدیک خریدار کو تب ہی اختیار مل سکتا ہے جبکہ مبیع میں موجودہ وصف طے شدہ وصف سے کم تر ہو، اگر اس سے بہتر وصف موجود ہو تو مشتری کو بیع فسخ کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ ان دونوں اقوال میں سے پہلا قول راجح اور زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ مقررہ وصف نہ ملنے کی صورت میں جب مشتری کا مقصد پورا نہیں ہو رہا تو گویا بیع کا اصل مقصد ہی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ رہا، اس لئے خریدار کو اختیار دیا جانا چاہئے۔

## خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمہور فقہاءِ احناف کے نزدیک اس بات کا اصل جواب یہ ہے کہ اگر مشتری کسی وصفِ مرغوب کی شرط لگائے اور بعد میں معلوم ہو جائے کہ مبیع میں اس سے اعلیٰ صفت موجود ہے لیکن خاص جس وصف کی قید

---

[1] البحر الرائق شرح كنز الدقائق مع منحة الخالق (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ٨٩/٦مكتبة رشيدية)

خریدار نے لگائی تھی وہ نہیں ہے، تو اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ خریدار جس مقصد کیلئے یہ چیز خرید رہا ہے اس کے لحاظ سے ان دونوں صفات میں کچھ خاص فرق ہے یا نہیں؟

اگر دونوں میں کوئی خاص تفاوت نہ ہو بلکہ دونوں سے خریدار کا غرض پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہو تو اس صورت میں اس کو خیار فسخ حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ بیع میں اصل لزوم و نفاذ ہی ہے بلا کسی معتد بہ بنیاد کے اس اصل سے عدول نہیں کیا جاسکتا، لیکن اگر اس اعلیٰ صفت سے خریدار کا غرض پورا نہیں ہو رہا بلکہ اسی صفت سے اس کا مقصد پورا ہو سکتا ہے جس کی اس نے خریدتے وقت شرط لگائی تھی تو ایسی صورت میں اس کو اختیار ہے چاہے تو بیع فسخ کرے اور چاہے تو یہی خرید لے۔

مثلاً اگر کوئی شخص دکاندار کے پاس آکر یہ کہے کہ مجھے سیلہ تازہ چاول دیدو، اور قیمت سو روپے فی کلو طے پایا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ چاول تازہ نہیں بلکہ پرانے ہے، تو یہاں اگرچہ مشتری کے بتائے ہوئے وصف سے اعلی اور قیمتی وصف موجود ہے کیونکہ تجار کے نزدیک چاول کا پرانا ہونا زیادہ مرغوب ہے، اور تجربہ کار لوگ پرانا چاول ہی پسند کرتے ہیں اسی لئے بازار میں اس کی قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

لیکن محض وصفِ اعلیٰ کی موجودگی کی وجہ سے خریدار کے خیار کو باطل نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ اس کے غرض کو دیکھا جائے گا کہ اس نے کس مقصد کیلئے خریدا ہے؟ اور جس مقصد کیلئے خریدا ہے اس کے اعتبار سے دونوں قسم چاول میں کوئی خاص تفاوت ہے یا نہیں؟

اگر تفاوت ہے اور مشتری کا مقصد پرانے چاول سے اچھی طرح حاصل نہیں ہو پا رہا تو ایسی صورت میں اس کو خیار فسخ حاصل ہے۔

## علامہ شامی کا رجحان

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی مسئلہ کے ضمن میں صاحب ہدایہ اور بعض دیگر فقہاء کرام کے متعارض جزئیات نقل فرمائے ہے، اس کے بعد یہ واضح فرمایا کہ دونوں قسم کے جزئیات میں اختلاف کی وجہ یہی اختلاف رائے ہے جو ابھی تحریر کیا گیا، اس تفصیل کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ومفاده تصحيح ثبوت الخيار وإن ظهر الوصف أفضل من المشروط إلا إذا لم يحصل التفاوت بين الوصفين في الغرض المقصود للمشتري كالعبد المسلم والكافر

"(اس تفصیل سے) معلوم ہوا کہ خریدار کو خیار الشرط ملنا بالکل درست ہے اگرچہ وہ سودا میں موجودہ صفت اس وصف سے بہتر ہو جس کا شرط لگایا گیا تھا، البتہ جہاں مشتری کے مقصد کے لحاظ سے دونوں اوصاف میں کوئی زیادہ فرق نہ ہو (تو وہاں خریدار کو خیار بھی نہیں ملے گا) جیسے کافر اور مسلمان غلام۔"[1]

---

[1] حاشية ابن عابدين على الدر المختار (كتاب البيوع، باب خيار الشرط قبيل باب خيار الرؤية، ٤/٥٩٠، ایچ ایم سعید)

علامہ علی حیدر آفندی رحمہ اللہ نے بھی بڑے جزم اور وثوق کے ساتھ یہی تحریر فرمایا:

إذا ظهر أن المبيع متصف بوصف أعلى من الوصف المشترط فإن كان التفاوت ما بين الوصفين مفوتا لغرض المشتري يثبت خيار الوصف وإلا فلا.

"جب واضح ہو جائے کہ مبیع میں مقررہ وصف سے بہتر صفت موجود ہے تو (پھر دیکھیں گے) اگر دونوں اوصاف کے درمیان فرق کی وجہ سے خریدار کا مقصد فوت ہو رہا ہو تو خیار وصف ثابت ہو گا ورنہ نہیں۔[1]

## نقصان ہونے کے باوجود بائع کو اختیار نہ ملنے کی وجہ:

جب مشتری کو وصفِ مرغوب کے فوت ہو جانے کی وجہ سے خیار فسخ حاصل ہوتا ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس زیر بحث مسئلہ میں بائع کو بھی خیار دیا جائے۔

وجہ ظاہر ہے کیونکہ مشتری کو اختیار دینے کی بنیاد یہی ہے کہ وصفِ مرغوب کے فوت ہونے کی صورت میں اس کی رضامندی متاثر ہوتی ہے، اور اس صفت سے خالی مبیع پر اس کی رضامندی پوری طرح معلوم نہیں ہوتی۔

---

[1] درر الحكام في شرح مجلة الأحكام (البيوع، الفصل الثاني في بيان خيار الوصف، ۱/۳۰۵، المكتبة العربية كوئته)

یہی حال یہاں بائع کا بھی ہے کہ اگروہ لاعلمی سے تازہ چاول کے بدلے اسی قیمت پر پرانا چاول مشتری کے حوالہ کرے اوراس کے بعد اصل حقیقتِ حال واضح ہو جائے تو ظاہر ہے کہ بائع اس پر قطعاً راضی نہیں کہ نئے چاول کی قیمت پر پرانا چاول بیچ دے، اسلئے مشتری کو خیار دئے جانے کا تقاضا ہے کہ بائع کو بھی اختیار ملنا چاہئے۔

لیکن فقہائے کرام نے اس قیاس پر عمل نہیں فرمایا بلکہ واضح طور پر لکھا کہ:

وفي المذروع يأخذ الأقل بكل الثمن أو يفسخ والزائد له بلا خيار للبائع. "[1]

"جو چیزیں ذراع کے لحاظ سے بیچی جاتی ہوں تو (ان میں اگر مبیع مطلوبہ مقدار سے کم نکلے تو) خریدار اس کو پوری قیمت سے خریدے یا بیع فسخ کرے، اور زیادہ نکلنے کی صورت میں جو کچھ زیادہ ہو گا وہ خریدار کا ہو گا، بائع کو اس میں کوئی اختیار نہیں۔

## ایک نکتہ

اس نکتہ پر جہاں تک غور کیا گیا یہی معلوم ہوا کہ دراصل بائع کو یہ صورتِ حال دو وجوہات کی بناء پر پیش آسکتی ہے یا تو مبیع کو پہلے سے نہ دیکھنے کی وجہ

---

[1] ملتقى الأبحر مع شرحه مجمع الانهر، كتاب البيوع، ۱/ ۱۸۔

سے یا اس سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے یعنی یا تو عدمِ رؤیت کی بناء پر یا عدم وقوف علی المبیع کی وجہ سے ایسا اتفاق ہو سکتا ہے۔

اور ان دونوں وجوہات کی بنیاد پر حاصل ہونے والے تمام خیارات مشتری ہی کو حاصل ہوتے ہیں، بائع کو نہ "خیارِ رؤیت" ملتا ہے اور نہ "خیارِ عیب" یا "خیار کشف الحال" سے استفادہ کر سکتا ہے۔

علامہ علی حیدر رحمہ اللہ نے عمدہ اور سلجھے ہوئے انداز تحریر میں اس قسم کے خیارات کی ایک فہرست لکھی ہے جو صرف خریدار کو حاصل ہوتے ہیں، بائع کو نہیں ملتے، اس میں یہ تینوں اقسام بھی لکھے ہے، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

الثاني: الخيار الذي يثبت للمشتري فقط وهو:
(١) خيار وصف المبيع. (٢) خيار الرؤية. (٣) خيار العيب. (٤) خيار كشف الحال. (٥) خيار تكشف الحال. (٦) خيار تفرق الصفقة بظهور المبيع ناقصا. (٧) خيار تفرق الصفقة بهلاك بعض المبيع قبل القبض. (٨) خيار الاستحقاق. (٩) خيار الخيانة. (١٠) خيار ظهور المبيع مستأجرا. (١١) خيار ظهور المبيع مرهونا.[1]

واضح رہے کہ یہ حکم تب ہے جب متعاقدین نے باقاعدہ فی گز کی قیمت ذکر نہ کی ہوں جیسا کہ اوپر مثال میں موجود ہے کہ مجموعہ کی قیمت ذکر کی گئی لیکن

---

[1] درر الحكام في شرح مجلة الأحكام (البيوع، الباب السادس في بيان الخيارات، ١/ ٢٨٨)

ہر ہر گز کی الگ الگ قیمت مقرر نہیں ہوئی، اگر ہر ہر گز کی قیمت ذکر کر دی جائے تو اس کا حکم وصف کا نہ رہے گا بلکہ اس کا حکم بعینہ وہی ہو گا جو فقہاء کرام نے اصل کا ذکر فرمایا جس کی تفصیل ذکر ہو چکی۔

## ذکر کردہ تفصیل کا خلاصہ:

آگے بڑھنے سے پہلے ذکر کردہ تفصیل کا خلاصہ دوبارہ ذہن نشین ہونا ضروری ہے تاکہ مسئلہ کے تمام پہلو کا استحضار رہے۔

یہاں تک کل تین مسائل ذکر ہو چکے:

۱۔ مکیلی اور موزونی وغیرہ اشیاء کی خرید وفروخت کی صورت میں مبیع کم یا زیادہ نکلنے کا حکم۔

۲۔ کپڑا اور اس کے قبیل کے دیگر اشیاء کی خرید وفروخت کی صورت میں مبیع کم یا زیادہ نکلنے کا حکم جبکہ فی گز قیمت مقرر نہ ہوئی ہو۔

۳۔ کپڑا وغیرہ اشیاء میں اگر خریدار اور دکاندار ہر ہر گز کی قیمت متعین کر دے، تو اس صورت میں مبیع کم یا زیادہ نکلنے کا حکم۔

یہ فقہاءِ کرام کے ان عبارات اور اس میں ذکر کردہ تفصیلات کا مختصر اور منضبط خلاصہ تھا جو انہوں نے اس مقام پر ذکر فرمایا ہیں۔

## زیر بحث مسئلہ کے متعلق ہدایہ کی عبارت

مزید اعتماد و تصدیق کیلئے ذیل میں صرف ہدایہ کی وہ عبارت پیش کی جاتی ہے جس میں آپ نے ان مسائل کی وضاحت فرمائی ہے۔

آپ تحریر فرماتے ہیں:

**(المسئلة الأولى)**

(١)قال: "ومن ابتاع صبرة طعام على أنها مائة قفيز بمائة درهم فوجدها أقل كان المشتري بالخيار إن شاء أخذ الموجود بحصته من الثمن، وإن شاء فسخ البيع" لتفرق الصفقة عليه قبل التمام، فلم يتم رضاه بالموجود، "وإن وجدها أكثر فالزيادة للبائع"؛ لأن البيع وقع على مقدار معين والقدر ليس بوصف

**(المسئلة الثانية)**

(١)"ومن اشترى ثوبا على أنه عشرة أذرع بعشرة فوجدها أقل فالمشتري بالخيار، إن شاء أخذها بجملة الثمن، وإن شاء ترك"؛ لأن الذراع وصف في الثوب؛ ألا يرى أنه عبارة عن الطول والعرض، والوصف لا يقابله شيء من الثمن كأطراف الحيوان فلهذا يأخذه بكل الثمن، بخلاف الفصل الأول؛ لأن المقدار يقابله الثمن فلهذا يأخذه بحصته، إلا أنه يتخير لفوات الوصف المذكور لتغير المعقود عليه فيختل الرضى.

قال: "وإن وجدها أكثر من الذراع الذي سماه فهو للمشتري ولا خيار للبائع"؛ لأنه صفة، فكان بمنزلة ما إذا باعه معيبا، فإذا هو سليم "

**(المسئلة الثالثة)**

(٣)ولو قال بعتكها على أنها مائة ذراع بمائة درهم كل ذراع بدرهم فوجدها ناقصة، فالمشتري بالخيار إن شاء أخذها بحصتها من الثمن، وإن شاء ترك"؛ لأن الوصف وإن كان تابعا لكنه صار أصلا بإفراده بذكر الثمن فينزل كل ذراع منزلة ثوب؛ وهذا لأنه لو أخذه بكل الثمن لم يكن آخذا لكل ذراع بدرهم "وإن وجدها زائدة فهو بالخيار إن شاء أخذ الجميع كل ذراع بدرهم، وإن شاء فسخ البيع" لأنه إن حصل له الزيادة في الذرع تلزمه زيادة الثمن فكان نفعا يشوبه ضرر فيتخير، وإنما يلزمه الزيادة لما بينا أنه صار أصلا، ولو أخذه بالأقل لم يكن آخذا بالمشروط.[1]

پہلا مسئلہ:

جس نے سو درہم کے عوض گندم کا ایک ڈھیر اس شرط پر خریدا کہ یہ سو من ہیں، خریدار نے اس کو سو من سے کم پایا تو اس کو اختیار ہے اگر چاہے تو موجودہ مقدار کو اس کی قیمت پر خریدے ورنہ تو بیع ختم کرے، اس لئے کہ عقد کے اندر تفریق آگئی جبکہ ابھی تک عقد تام بھی نہیں ہوا جس کی وجہ سے مشتری موجودہ مقدار پر پوری طرح رضامند نہیں ہوا، اور اگر خریدار نے ڈھیر

[1] الهداية في شرح بداية المبتدي (كتاب البيوع، ١٣/٥، مكتبة البشري)

کو اس کے مقررہ مقدار سے زیادہ پایا تو زائد گندم دکاندار کے ہوں گے، اس لئے کہ اصل سودا ایک خاص مقدار کی ہوئی تھی اور مقدار وصف نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ:

جس نے ایک کپڑا دس درہم کے عوض اس شرط پر خریدا کہ یہ دس گز کپڑا ہے، مشتری نے اس کو کم پایا تو اس کو اختیار ہے اگر چاہے تو پوری قیمت پر خریدے ورنہ تو چھوڑ دے کیونکہ کپڑے میں گز وصف ہے۔

آیا آپ نہیں دیکھتے کہ گز لمبائی اور چورائی ہی کا نام ہے، اور وصف کے مقابلے میں ثمن نہیں آتا جیسے جانور کے اعضاء کے مقابلے میں مستقل طور پر کوئی ثمن نہیں آتا۔

یہی وجہ ہے کہ اگر خریدار وہ چیز لینا چاہے تو پوری قیمت پر خرید سکتا ہے، پہلے مسئلے کے خلاف کیونکہ وہاں مقدار کے مقابلے میں ثمن لازم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں موجودہ مقدار کے برابر قیمت کے بدلے خریدے گا، تاہم چونکہ مقررہ وصف موجود نہیں اس لئے اس کو اختیار ملے گا وجہ اس کی یہ ہے کہ جس چیز پر عقد ہوا تھا وہ بدل گیا جس کی وجہ سے رضامندی میں خلل واقع ہو گیا۔

اسی صورت میں اگر کپڑا مقررہ گز سے زائد نکلا تو زائد گز خریدار کے ہوں گے جس میں دکاندار کو کوئی اختیار نہیں ملے گا اس لئے کہ گز وصف ہے تو یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی معیوب چیز بیچی اور وہ صحیح سلامت نکلی (تو یہ صحت اور سلامتی کی صفت مشتری کو مفت میں ملے گی)۔

تیسرا مسئلہ:

اگر بائع نے کہا کہ میں نے کپڑا (تیرے ہاتھ) سو درہم کے بدلے بیچا اس شرط پر کہ یہ سو گز ہیں، فی گز ایک درہم کے بدلے۔ مشتری نے اس کو مقررہ مقدار سے کم پایا تو اس کو اختیار ہے اگر چاہے تو موجودہ کپڑے کے برابر قیمت سے خریدے ورنہ تو واپس کرے، اس صورت میں وصف اگرچہ تابع ہے لیکن مستقل طور پر ذکر کرنے کی وجہ سے یہ اصل بن گیا اور ہر گز مستقل کپڑے کی طرح ہو گیا، کیونکہ خریدار اگر اس ناقص کپڑے کو پوری قیمت پر خریدے تو فی گز کپڑے لینے والا شمار نہ ہو گا۔

اور اگر اس نے یہ کپڑا مقررہ مقدار سے زیادہ پایا تو پھر بھی اختیار ہے اگر چاہے تو پورا کپڑا فی گز ایک درہم کے حساب سے خریدے ورنہ تو چھوڑ دے، کیونکہ اگر اس کو مزید گز ملے تو اس کی وجہ سے مزید ثمن بھی لازم ہو گا جس کی وجہ سے اس فائدہ

میں نقصان کا پہلو بھی شامل ہو جائے گا اس لئے اس کو اختیار ہو گا اور (پورا کپڑا خریدنے کی صورت میں) مزید رقم بھی دے گا جس کی وجہ وہی ہے جو ہم پہلے تحریر کر چکے، اگر کم قیمت پر خریدا تو یہ مقررہ قیمت پر خریدنے والا شمار نہیں ہو گا۔"

## موجودہ دور میں کپڑے کی نوعیت:

کپڑے کی قدیم و جدید طریقہ تجارت میں کیا فرق ہے؟ کیا اب بھی قدیم طرز کے مطابق کپڑے کا لین دین ہوتا ہے یا اس میں کچھ تبدیلی آئی ہے؟ اور قدیم و جدید طرزِ تجارت میں اگر کچھ فرق ہے تو وہ کیا ہے؟ حضرات فقہاءِ کرام رحمہم اللہ نے جن بنیادوں پر اصل اور وصف کا مذکورہ فرق فرمایا، کیا عصر حاضر میں بھی وہ فرق کرنا درست یعنی واقع کے مطابق ہے یا نہیں؟

ان باتوں کو معلوم کرنے اور اس سے پوری طرح واقف ہونے کیلئے اولاً کپڑے کا کاروبار کرنے والے بعض تاجروں سے زبانی بات چیت ہوئی جس سے کچھ جزوی معلومات تو حاصل ہوئے، لیکن پوری طرح تسلی و اطمینان حاصل نہ ہو سکا جس کی وجہ سے خود بازار جانا طے ہوا۔

## تاجروں کے ساتھ بات چیت کا خلاصہ

وہاں ان حضرات سے بات چیت ہوئی، ان کے خرید و فروخت کا جائزہ لیا گیا، مختلف حوالے سے معلومات حاصل کرنے اور تاجروں کے ساتھ تفصیلی بات چیت کرنے سے مندرجہ ذیل اہم معلومات حاصل ہوئیں:

۱"۔ کپڑا تھان کے اعتبار سے فروخت ہوتا ہے، تھان میں متعین میٹر ہوتے ہیں اور ان میٹروں ہی کے بنیاد پر قیمت مقرر کی جاتی ہے۔

۲۔ تاجر لوگ ہمیشہ میٹر ہی کے اعتبار سے خریدتے اور فروخت کرتے ہیں۔

۳۔ اپنے حساب وکتاب کی حد تک بھی وہ پورے تھان کی قیمت اس کے میٹروں پر باقاعدہ تقسیم کرتے ہیں، پھر ہر میٹر پر اپنا منافع لگا کر فروخت کرتے ہیں، عام لوگوں کے سامنے اصل لاگت کا اظہار کرنا تجارت کے اصول کے خلاف ہے، لیکن اپنی حد تک اور اپنے دوست واحباب کے سامنے یہی بات رکھی جاتی ہے کہ ہم نے فی میٹر اتنے روپے کا خریدا ہے، مثلاً اگر ایک تھان میں بیس میٹر ہے اور دکاندار نے فیکٹری سے چار ہزار کا پورا تان لیا ہے تو وہ یہی سمجھتا اور کہتا ہے کہ مجھے دوسو روپے فی میٹر کپڑا ملا ہے۔

۴۔ اگر کمپنی یا بڑے ڈیلر سے ہم خریداری کریں اور کپڑا مقررہ مقدار سے کم ہو مثلاً ایک بیس میٹر والا تھان انیس گز کا نکلا، تو ایسی صورت میں ہم ان سے شکایت کرتے ہیں اور وہ بخوشی قبول کر لیتے ہیں، اور ایسی صورت میں ہم ایک میٹر کپڑا یا اس کے برابر پیسے وصول کر سکتے ہیں، لیکن عموماً پیسے نہیں لیتے نہ ہی کپڑا وصول کرتے ہیں، بلکہ آئندہ سودے میں اس کے برابر پیسے کٹ جاتے ہیں۔

۵۔ اسی طرح اگر بڑے ڈیلر کی طرف سے ہمیں غلطی کی وجہ سے کپڑا زیادہ ملا تو ہم اس کو واپس کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، الاَّ یہ کہ کوئی جھوٹ بول کر اپنے لئے بچائے۔

۶۔ اگر عام دکاندار کوئی سوٹ بیچے جو عام طور پر چار میٹر کا ہوتا ہے، لیکن غلطی کی وجہ سے وہ کم نکلا، تو گاہک اگر یہ بات ثابت کرے تو دکاندار ذمہ دار ہوگا، اور اگر چار میٹر کے بجائے پانچ دیدے تو خریدار اس بات کا مکلف ہے کہ وہ ایک میٹر یا اس کی قیمت واپس کرے، اگر وہ واپس نہیں کر رہا تو دکاندار اس سے زبردستی کے ساتھ لے سکتا ہے، اور یہ دکاندار کی طرف سے ظلم وبدمعاشی نہیں بلکہ اپنا جائز حق وصول کرنا شمار ہوگا۔"

## موجودہ نوعیت فقہی اصول کی روشنی میں:

امام محمد رحمہ اللہ کا کلام اوپر ذکر کیا جا چکا، جس سے یہ ضابطہ حاصل ہوا تھا کہ جن اشیاء کی مجموعی قیمت اس کے اجزء وافراد پر منقسم ہوتی ہو اس میں اگر کمی زیادتی ظاہر ہو جائے، تو ایجاب وقبول کے دوران طے شدہ مقدار ہی مبیع متصور ہوگی۔

زیادہ نکلنے کی صورت میں وہ مقدار بیچنے والے ہی کی ملکیت شمار ہوگی، اور کمی کی صورت میں خریدار کو اختیار دیا جائیگا، اور اگر کوئی چیز ایسی ہو کہ جس کی مجموعی قیمت اس کے اجزاء پر تقسیم نہ کی جا سکے یا لوگوں کے ہاں منقسم نہ سمجھا جاتا ہو تو اس میں اگر زیادہ چیز خریدار کے ہاتھ آئے تو وہ بلا اختیار مفت میں اسی کو دیا جائے گا۔ فقہاء کرام نے عام طور پر اس کی مثال کپڑے سے دی ہیں۔

لیکن یہ اس زمانے کی بات ہے جب کپڑا انسان اپنے ہاتھ کی کاریگری سے بناتا تھا، ظاہر ہے کہ دو انسانوں کے فعل میں پوری طرح موافقت اور مکمل صفائی

کیسے برقرار رکھی جاسکتی ہے، اسی بنیاد پر اس زمانے میں کپڑا ذوات القیم اشیاء ہی میں سے شمار کیا جاتا تھا۔

## انسانی صناعت کے متعلق ایک قاعدہ

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے علامہ زاہدی سے ایک ضابطہ نقل فرمایا ہے کہ:

قال في حاوي الزاهدي: أتلف دبسه فعليه قيمته؛ لأن كل ما كان من صنيع العباد لا يمكنهم مراعاة المماثلة لتفاوتهم في الحذاقة،

"حاوی زاہدی میں لکھا ہے کہ اگر کسی نے دوسرے کا شیرہ ضائع کیا تو اس پر اس کی قیمت لازم ہو گی کیونکہ جو چیز بھی لوگوں کی عمل اور کاریگری سے بنے، اس (کے مختلف افراد) میں برابری ممکن نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگ مہارت میں برابر نہیں ہوتے (بلکہ کام کی مہارت اور ہاتھ کی صفائی وغیرہ کی وجہ سے مصنوعات میں ضرور کوئی نہ کوئی فرق ہو جاتا ہے)۔"[1]

جامع الفصولین کے جس باب کا شروع میں حوالہ دیا گیا، اس میں اس بات کا یہاں تک لحاظ رکھا گیا ہے کہ مثلی اور قیمی کی تعریف کے دوران ہی "غیر

---

[1] حاشية ابن عابدين على الدر المختار ، كتاب الغصب، قبيل مطلب الصابون مثلي أو قيمي، ١٨٣/٦)

المصوغ" کی قید لگائی اور اس کی وجہ محشی (علامہ خیر الدین رملی رحمہ اللہ تعالیٰ) نے یہ بیان فرمائی ہے کہ:

لأن كل ما من صنيع العباد لا يمكنهم مراعاة المماثلة لتفاوتهم في الحذاقة

"مہارت (اور کاریگری) میں مختلف ہونے کی وجہ سے انسانوں کی مصنوعات میں (پوری طرح یکسانیت کی) رعایت ممکن نہیں ہوتی۔"

امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی کپڑے کے اسی نوعیت کا لحاظ کر کے اس پر تفریعات کی ہے، چنانچہ آپ کتاب الاصل میں تحریر فرماتے ہیں:

إذا اشترى الرجل جراب هروي أو عدل زطي أو سمنا أو زيتا في زق أو حنطة في جوالق ولم ير شيئا من ذلك فهو بالخيار إذا رآه--فإن رأى بعضها ولم ير كله فهو فيما بقي من الثياب بالخيار ويرد ما لم ير وما قد رأى، ولو بقي ثوب واحد لم يره كان له أن يردها جميعا، وكذلك كل حيوان أو عروض مما لا يكال ولا يوزن، أما السمن والزيت والحنطة فإن كان الذي لم يره مثل الذي قد رآه فهو له لازم لأنه شيء واحد

"اگر کسی نے ہرات کے چمڑے کا تھیلہ خریدا یا زوطی کپڑے کا بنڈل یا گھی یا تیل مشک میں خریدا اس طرح بوریوں کے اندر گندم خریدا، ان تمام صورتوں میں خریدار نے

مبیع کو دیکھا نہ ہو تو دیکھنے کے بعد اس کو اختیار حاصل ہے (چاہے تو خریدے اور چاہے تو واپس کرے)۔

اور اگر پورے مبیع کو نہیں دیکھا لیکن کچھ کچھ دیکھا ہو تو جو کپڑے نہ دیکھے ہو اس میں واپسی کا اختیار حاصل ہوگا اگر چاہے تو سب کپڑے واپس کرے اور اگر چاہے تو صرف وہ کپڑے واپس کرے جن کو پہلے سے نہیں دیکھا، اگر ایک کپڑا بھی دیکھنے سے رہ گیا ہو تو بھی تمام کپڑے واپس کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔اسی طرح (واپسی کا اختیار )اس جانور یا سامان میں بھی حاصل ہوگا جو وزن یا کیل (پیمانہ) کے ساتھ بیچے جاتے ہوں۔

البتہ گھی، تیل، گندم وغیرہ اشیاء میں سے اگر کچھ دیکھا اور کچھ رہ گیا تو(اس کا حکم یہ ہے کہ) اگر نہ دیکھی ہوئی چیز دیکھی ہوئی چیز کی طرح ہو تو اس کا قبول کرنا ضروری ہے اور مشتری کو اس میں اختیار حاصل نہیں ہوگا کیونکہ یہ (چیزیں عام طورپر) ایک دوسرے کے مانند ہوتی ہیں( لہٰذا تمام مبیع کو دیکھنا کوئی ضروری نہیں بلکہ نمونہ کے طور پر ایک حصے کو

دیکھنا بھی کافی ہے اور اس کے دیکھنے سے مشتری کا خیار رؤیت ساقط ہو جائے گا)۔[1]

اس عبارت میں امام محمد رحمہ اللہ نے جو مسئلہ بیان فرمایا، وہ اسی تصور پر مبنی ہے کہ کپڑا ذوات القیم میں سے ہے، ایک کپڑا دوسرے سے بالکل مختلف ہوتا ہے، ایک جگہ اور ایک شہر کے بنے ہوئے کپڑے بھی ایک دوسرے کی ایسی مانند نہیں ہوتی کہ ایک کو دیکھنا کافی ہو جائے، بلکہ اگر تمام کپڑوں کا معاینہ کرے اور اس پر رضامندی بھی ظاہر کرے تو بھی جب تک ایک کپڑے کو نہیں دیکھا تو دیکھنے کے وقت اس کو اختیار حاصل ہوگا۔

اسی عبارت کے آخر میں گندم وغیرہ چند ذوات الامثال کا تذکرہ ہوا کہ اس میں ہر ہر کلو کو دیکھنا کوئی ضروری نہیں بلکہ نمونہ کے طور پر تھوڑا سا حصہ دیکھنا کافی ہے اور اگر باقی گندم اسی معیار کے مطابق ہو تو خریدار کو خیار رؤیت بھی حاصل نہیں ہوگا، دونوں مسئلوں میں فرق کی بنیاد میں کپڑے کی یہی حیثیت کارِ فرما ہے کہ یہ ذوات القیم میں سے ہے۔

بعد کے فقہائے کرام نے بھی کپڑے کی یہی نوعیت برقرار رکھی اور اس پر مختلف تفریعات کئے۔

---

[1] كتاب الأصل للامام محمدالشيباني، باب الخيار بغير شرط، ٤٧٢/٢

## موجودہ دور میں کپڑا مثلی ہے:

یہ اس زمانے کے مطابق بالکل قرین قیاس بھی تھا، لیکن جب سے کپڑا انسانی ہاتھوں سے نکل کر مشین سے بنایا جانے لگا، ہر ہر فیکٹری میں مشینیں نصب کی جانے لگی جس سے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ایک ہی جیسے کپڑے تیار ہوتے ہیں، ان کے درمیان آپس میں کوئی قابلِ لحاظ فرق نہیں ہوتا، تو اس کے بعد اس کی وہ سابقہ حیثیت ختم ہوگئی، اور اب یہ قیمی کی فہرست سے نکل کر مثلی کے حدود میں داخل ہوئی۔

علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ تعالی کا مایہ ناز شاگرد علامہ فتح محمد تائب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

"تنبیہ: بہت سی چیزیں گذشتہ زمانے میں خلقی تفاوت یا دستی صناعت میں اختلاف کی وجہ سے مثلی نہیں تھیں، لیکن موجودہ زمانوں میں کارخانوں، کلوں اور نمبروں کی وجہ سے مثلی ہوگئی ہیں"[1]

صناعت اور کاریگری کے اس اختلاف کی وجہ سے موجودہ دور میں کپڑا مثلی بن گیا، اگر کوئی شخص اس کی لین دین کرتا ہے تو میٹر/گز ہی کے اعتبار سے قیمت تقسیم کرکے کرتا ہے، اگر زبان سے صراحت نہ بھی کرے تو بھی یہی سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] (عطرِ ہدایہ، ص۶۸)

## کپڑے کے مسئلہ کا خلاصہ

اب اگراس روش کے مطابق کوئی کپڑا خریدے اور بعد میں ظاہر ہو جائے کہ دکاندار کی طرف سے غلطی کے ساتھ کپڑا مقررہ مقدار سے کم یا زیادہ ملا ہے تواس صورت میں یہ زیادہ کپڑا خریدار کا نہیں ہو گا بلکہ دکاندار کی ملکیت ہے اگرچاہے تو مستقل قیمت لیکر خریدار پر فروخت کر سکتا ہے۔

اوراگر متعینہ مقدار سے کم نکلا، مثلاً آٹھ سو روپے کا چار میٹر کپڑا لیا تھا اور وہ نکلا تین میٹر، توایسی صورت میں یہ نہیں کہا جائیگا کہ میٹر چونکہ "وصف" ہے جس کے مقابلے میں ثمن نہیں آتا اسلئے خریدار اگر لینا چاہے تو یہ تین میٹر ہی پورے آٹھ سو کے لینے ہوں گے، بلکہ مندرجہ بالا تفصیل کے مطابق میٹر اصل ہی ہے، لہٰذا خریدار کو تفریق صفقہ کی بنیاد پر فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہو گا(جس کی تفصیل قاعدہ نمبر ۴ میں ذکر ہو چکی) لیکن اگر خریدار یہی تین گز لینا چاہے تو ایک میٹر کی قیمت منہا کر کے چھ سو روپے کا لے سکتا ہے۔

## زمین کا مسئلہ اوراس کی تحقیق:

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ زمین کی قیمت مختلف عوامل کی وجہ سے مختلف ہوتی رہتی ہے، دو مختلف زمینیں مقدار میں برابر ہوں گے لیکن ساخت، محل

وقوع، حدود اربعہ اور علاقائی صورت حال کی وجہ سے دونوں کی قیمتوں میں بے تحاشا فرق ہوتا ہے، اسلئے نفسِ زمین کو ہر حال میں مثلی قرار دینا مشکل ہے[1]۔

لیکن اس کے باوجود آج کل زمین کے لین دین کی جو صورت مروج ہے وہ مرلہ، فٹ یعنی مقدار ہی کے ذریعے ہے، اگر کوئی شخص زمین خریدنا چاہے تو فروخت کنندہ عام طور پر مرلہ ہی کے ذریعے فروخت کرتا ہے، پراپرٹی ڈیلنگ کا اکثر جگہوں پر یہی طریقہ کار ہے، مقدار سے قطعِ نظر رکھ کر صرف اٹکل اور تخمین کی بنیاد پر زمین کی خرید و فروخت بہت کم ہے۔

اس طریقہ کار کی بنیاد بھی اس پر ہے کہ لوگوں کی نظر میں زمین کے مجموعے کی قیمت مرلہ وغیرہ مقدار پر تقسیم ہوتی ہے، اور شروع میں یہ بات بنیاد اس پر ہے کہ مجموعے کی قیمت اس کے اجزاء پر تقسیم ہوتی ہے یا نہیں؟ تفصیل سے گزر چکی کہ مسئلے کا مدار صرف مثلی یا قیمی ہونے ہی پر نہیں بلکہ اصل

---

[1] یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام زمین بھی کو ذوات القیم اشیاء کي فہرست میں شمار کرتے ہیں، کشاف اصطلاحات الفنون کے حوالے سے علامہ قاضی محمد تھانوی صاحب رحمہ اللہ کی عبارت ابتداء، میں ذکر ہوچکی جس میں زمین کو ذوات القیم اشیاء میں سے شمار کیا تھا، تقریباً تمام حضرات فقہاء کرام کے نزدیک بھی زمین کی حیثیت ہے اسی حیثیت کو مد نظر رکھ کر اس پر تفریعات کرتے ہیں، چنانچہ "مختصر القدوری" میں ہے: ومن اشترى دارا بعرض أخذها الشفيع بقيمته وإن اشتراها بمكيل أو موزون أخذها بمثله، وإذا باع عقارا بعقار أخذ الشفيع كل واحد منهما بقيمة الآخر (مختصر القدوري، كتاب الشفعة، 108-اس جزئیہ میں زمین کو قیمیات میں سے تسلیم کیا گیا ہے۔

اس کا واحد فیصلہ عرف ہی کو مد نظر رکھ کر کیا جاسکتا ہے، اور جب زمین کے بارے میں لوگوں کا یہ عرف ہے تو اس کا حکم بھی یہی ہے کہ اگر لین دین کے بعد ظاہر ہو جائے کہ خریداری میں جو مقدار مقرر ہوئی ہے زمین اس سے کم یا زیادہ ہے تو اس میں وہی تفصیل ہو گی جو فقہاء کرام نے مکیلی اور موزرونی اشیاء کے حکم کی ضمن میں لکھی ہے جس کی تفصیل اوپر درج ہو چکی۔

هذا آخر ما أريد أن أجمع من كلام ساداتنا الفقهاء الكرام نوَّر الله قبورهم ورزقنا من علمهم وفقههم وإخلاصهم ما نرضي به ربنا۔ آمين يا رب العلمين

إن يكن صوابا فمن الله تعالى –الذي منّ علينا بمحض فضله ورحمته– وإن يكن خطأ فمني ومن الشيطان وأعوذ بالله العظيم من أن تصف لساني الكذب: هذا حرام وهذا حلال.

كتبه الفقير الحقير عبيد الرحمن غفرالله له جميع سيئاته،

بدار الإفتاء دارالعلوم الرحمانية، مردان

# مراجع ومصادر

1. البحر الرائق شرح كنز الدقائق مع منحة الخالق ، مكتبة رشيدية
2. بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع مكتبه رشيديه، كوئته
3. البناية شرح الهداية ، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان
4. الجامع الصغير،عالم الكتب، بيروت
5. جامع الفصولين إسلامي كتب خانه، بنوري تاؤن، كراچي
6. حاشية ابن عابدين على الدر المختار، ايچ ايم سعيد
7. درر الحكام في شرح مجلة الأحكام المكتبة العربية كوئته
8. شرح المجلة للعلامة محمد خالد الأتاسي، مكتبه رشيديه، كوئته
9. عطرِ هداية، زمزم پبلشزر كراچی
10.العناية شرح الهداية علي هامش فتح القدير، مكتبه حقانيه، بشاور
11.فتاوى قاضيخان، قديمي كتب خانه، كراچي
12.فتح القدير للعاجز الفقير، مكتبه حقانيه، بشاور
13.قنية المنية، كلكته، هندوستان
14.كتاب الأصل، مكتبة الأحرار، مردان
15.كشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، مكتبة لبنان
16.مجلة الأحكام العدلية، مير محمد كتب خانه ، كراچی
17.مجمع الأنهر في شرح ملتقي الأبحر،مكتبه عمريه بلوچستان
18.المجموع شرح المهذب، دار الفكر، بيروت، لبنان
19.المحيط البرهاني في الفقه النعماني،إدارة القران والعلوم الإسلامية، كراچي
20.مختصر القدوري، دار الكتب العلمية
21.المغني لابن قدامة، وزارة شئون المطبوعات
22.ملتقى الأبحر مع شرحه مجمع الأنهر، مكتبه عمريه بلوچستان
23.المهذب في فقة الإمام الشافعي للشيرازي، دار الكتب العلمية
۲۴.الهداية في شرح بداية المبتدي، مكتبة البشرى، كراچي